سہ ماہی ادبی محاذ کٹک
JAN-MAR 2017
Vol-1 Issue-2
گوشۂ ڈاکٹر فریاد آزرؔ
مدیر سید نفیس دسنوی

بیادِ پروفیسر سید منظر حسن دسنوی مرحوم
اور سید شکیل دسنوی مرحوم
شعروادب کی صالح قدروں اور عصری رجحانات کا ترجمان
سہ ماہی ادبی محاذ کٹک

اشاعت کا تیرھواں سال	۵۰ رواں شمارہ

سرپرست: انجینئر سید آصف دسنوی
مدیر اعلیٰ: سعید رحمانی
موبائل۔ 07735860991 (صرف SMS کے لیے)
08763623951 (برائے SMS)

مدیر: سید نفیس دسنوی Mob:9437067585
معاون مدیر: سیّد نور الٰہی ناطق Mob:9237427933

منیجنگ ایڈیٹر
سمیع الحق شاکر موبائل 9861148800
کمپیوٹر کمپوزنگ:۔ سید مصطفیٰ علی موبائل۔ 8984218600

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ
سعید رحمانی، اخبار اڑیسہ پبلی کیشنز، دیوان بازار۔ پوسٹ۔ بخشی بازار، کٹک۔
09437067585753001 (ضروری جانکاری کے لیے)
E-mail: adbimahaz@gmail.com
E-mail: Sayeedrahmani@gmail..com
Website: www.adbimahaz.yolasite.com

قیمت فی شمارہ: ۲۵ روپے زرِ سالانہ: ۱۰۰ روپے
رجسٹری ڈاک سے زرِ سالانہ۔ ۱۸۰ روپے
خصوصی زرِ سالانہ: ۲۰۰ روپے بیرونِ ممالک: ۲۵ امریکی ڈالر
(چیک یا ڈرافٹ پر نام کی جگہ صرف Md. Sayeed لکھیں۔ پتہ نہ لکھیں۔ چیک کے ذریعہ زرِ سالانہ ۱۲۵ روپے ارسال کریں۔ بیرون ملک کے لئے ۳۰ امریکی ڈالر)
IndianOverseasBank-A/CNo.172201000001688
IFSC Code-IOBA 0001722-Branch-HaripurRoad,Cuttack
عدالتی چارہ جوئی صرف کٹک کی عدلیہ میں قابلِ سماعت ہوگی
مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

پبلیشر و پرنٹر شیخ قریش نے چتا پریس قاضی بازار سے چھپوا کر دیوان بازار کٹک سے شائع کیا

یادوں کی دہلیز سے
سید شکیل دسنوی مرحوم

غزل

عمر بھر ناکامیوں کے دل پہ یوں نشتر چلے
زندگی کی آرزو میں ہم تو آخر مر چلے

کیا قیامت کی گھڑی تھی جانتا ہے دل ہی کچھ
شب نے جب آنچل سمیٹا اور تم اٹھ کر چلے

ہائے کس کا ذکر آیا یہ شب مہتاب میں
نام پر ان مے فروش آنکھوں کے اب ساغر چلے

دور تک داماں نہ چھوڑا دل کا تیری یاد نے
ہو کے جب مایوس ہم در سے ترے اٹھ کر چلے

گردشِ تقدیر ہو یا گردشِ دوراں شکیلؔ
کیسے کیسے چار دن کی زیست میں چکّر چلے

بشکریہ
سیدہ ثمین حسن (حیدرآباد)

ہمارے خصوصی معاونین

اپنی پنشن کی رقم سے ''اخبارِ اڑیسہ'' کا لگایا ہوا پودا اب اللہ کے فضل وکرم سے برگ و بار لا کر سہ ماہی ''ادبی محاذ'' کی صورت میں ارتقائی سفر طے کرنے لگا ہے۔میری تنہا ذاتی کوششوں سے شروع کیا ہوا یہ سفراب 'لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا' کے مصداق ایک ادارے کی شکل اختیار کر گیا ہے جس میں مقامی احباب کے دامے درمے سخنے تعاون کے ساتھ ہی کل ہند سطح پر دیگر محبانِ اردو نے اپنی طرف سے ایک ہزار سے لے کر پانچ ہزار تک کے عطیات دیے ہیں اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ان میں سے بعض نے وقفے وقفے سے رقم بھیجتے رہنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔تمام محبانِ اردو سے نہ صرف کل ہند بلکہ عالمی سطح پر بھی لائف ممبر شپ قبول کرنے کی گزارش ہے۔

خصوصی معاونین کے اسمائے گرامی

نام	مقام
الحاج محمد ایوب خاں	بھوبنیشور
الحاج سیّد عطا محی الدین	بھدرک
الحاج سیّد ڈاکٹر مشتاق علی	کٹک
الحاج مولوی سیّد نذیر الدین صدیقی (ایڈوکیٹ)	کٹک
جناب محمد شاہنواز	بھوبنیشور
جناب سہیل اختر	بھوبنیشور
جناب عبدالمجید فیضی	سمبل پور
جناب ایم اے احد	بھوبنیشور
جناب محمد اسلم غازی	ممبئی
جناب سیّد علی شبنم کارواری	تھانے
ڈاکٹر محمد قمر الدین خاں	کٹک
جناب ایس این شیخ	ممبئی
مولوی محمد مطیع اللہ نازش	کٹک
جناب شیخ منور احمد حبیبی	دھام نگر (اڑیسہ)
جناب محب الرحمٰن وفاؔ	یوڈا،مہاراشٹر
جناب وکیل نجیب	ناگپور
جناب سیّد محمود رضی الدین	راجستھان
جناب اقبال سلیم۔	بنگلور

نام	مقام
جناب ایم حمید الدین ناز	بیدر
پالوجی ڈاکٹر جاوید حسین	ممبئی
مس انجم ممتاز سلطانہ	بیدر
جناب رفیق شاہین	علی گڑھ
جناب سمیع الحق شاکر۔	کٹک
ڈاکٹر سید مجیب الرحمٰن بزمیؔ	رانچی
ڈاکٹر جمال الدین احمد	بھوبنیشور
ڈاکٹر کرشن بھاوک۔	پٹیالہ
سید فرید منظر حسن۔	کٹک
ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی	نیپال
ڈاکٹر قمر الزماں۔	دھنباد
جناب بی۔ایس۔جین جوہرؔ	میرٹھ
مولانا پھول محمد نعمت رضوی	مظفر نگر (بہار)
جناب ارشد قمر	ڈالٹن گنج
ڈاکٹر ملکہ خورشید	لکھنؤ
حاجی اختر حسین	بیل پہاڑ۔جھاڑسوگڈا
جناب جمال قدوسی	سدھارتھ نگر (یوپی)
جناب شمس الحق شمسؔ (ایڈوکیٹ)	دیوپور (کٹک)

نام	مقام
ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری	کٹک
ابوالکمال ظفر احمد (ایڈوکیٹ)	بالیسر
جناب ارشد جمیل	کٹک
جناب شیخ بشیر احمد	کشمیر
جناب نظام مجھولیاوی	مظفر پور (بہار)
جناب رمیش پرساد کنول	پٹنہ
جناب اسحاق عابد	چنئی
ڈاکٹر مختار شمیم	بھوپال
بانو مہر سلطانہ بنت حمید الدین	بیدر (کرناٹک)
جناب جاوید ندیم	ممبئی
جناب فیروز احمد سیفی	نیویارک (امریکہ)
پروفیسر سید محمد استخار الدین	بجنور (یوپی)

ادبی محاذ کے گوشے

اگلے شمارے میں غلام سرور ہاشمی کے گوشے کا انتظار کریں۔وہ ایک جواں فکر شاعر ہیں جن کی غزلوں میں روایت کی پاسداری کے ساتھ عصری حسیت بھی پائی جاتی ہے۔ان کا تعلق گوپال گنج بہار سے ہے۔

ادبی محاذ کے یہ گوشے نئے اور پرانے ہرطرح کے شاعروں اور ادیبوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور ادبی حلقوں میں پسند بھی کیے جارہے ہیں۔آپ کے لیے بھی ادبی محاذ کے صفحات حاضر ہیں۔

اس شمارے میں

4۔محاذِاول:

انٹرنیٹ کے زمانے میں اردو کتابی میلے قاضی مشتاق احمد

۔محاذِثانی

5۔اپنی بات سید نفیس دسنوی

6۔حمد و نعت۔شمیم یوسفی، ڈاکٹر علی عباس امید، غلام مرتضیٰ راہی، انجم باروی، شمسی قریشی، محسن باعشن حسرت

7۔حمد و نعت۔ظفر اقبال ظفر، فہیم انور، قدیر احمد قدیر، مقبول منظر، ظہیر احمد، مختار احمد کوثر

8۔گوشۂ احباب

9۔آخری غزل ظہیر غازیپوری

منظومات:۔

10۔عبدالمجید فیضی، محمد باعشن مغموم، کرشن پرویز

11۔ابرار نغمی، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، ڈاکٹر مسعود جعفری، ڈاکٹر سید مظفر عالم ضیا

گوشۂ ڈاکٹر فریاد آزر

12۔سوانحی اشارے۔ایک تعارف ادارہ

13۔فریاد آزر۔تخلیقی اڑان۔۔۔۔ حقانی القاسمی

14۔منفرد لب و لہجہ کا شاعر پروفیسر ابن کنول

15۔فریاد آزر کی تخلیقی آزری ڈاکٹر کوثر مظہری

17۔فریاد آزر شگفتہ خیال شاعر عمران عظیم

18۔سبز آدمی کی تلاش پروفیسر مولا بخش

26۔فریاد آزر کی غزلوں میں۔۔۔۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

29۔سبز ساعتوں کا شاعر ڈاکٹر ممتاز الحق

30۔گلوبل گانو کا نمائندہ شاعر سعید رحمانی

33۔ڈاکٹر فریاد آزر کی شعری کائنات

35۔ڈاکٹر فریاد آزر کے منتخب اشعار سید نفیس دسنوی

مضامین

36۔ظہیر غازیپوری کی رباعی علیم صبا نویدی

37۔ظہیر غازیپوری جنھیں برسوں۔۔۔ ڈاکٹر محمد چاند نظامی

38۔نئے سال کی آمد (ایک نظم) ناوک حمزہ پوری

39 ادب اور صحافت ڈاکٹر محبوب فرید

40۔سارے جہاں سے اچھا۔۔۔۔۔۔۔ منظور پروانہ

42۔چوٹی کانفرنس رزاق اثر

44۔عروسِ فکر کو خوشبوئے حنا۔۔۔اختر شاہجہانپوری یعقوب بدایونی

غزلیات

45۔مہدی پرتا پگڑھی، اختر کاظمی، جاوید ندیم، ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق اشتیاق کامل، نادر اسلوبی

46۔میکش اجمیری، عبدالشکور پروانہ، سید اسلم صدا آمری، پی۔سری واستو آنند، ڈاکٹر یوسف صابر، تجمل شفائی

47۔ڈاکٹر رضی امروہی، عبدالسلام کوثر، عبدالحی پیام انصاری، اوج اکبرپوری، اظہر نیر، شارق عدیل

48۔رحمت علی رحمت، میش کنول، صابر فخر الدین، ڈاکٹر کلب حسن حزیں، مظہر محی الدین، بدر محمدی

افسانے:۔

49۔ذرا نم ہو۔۔۔۔۔۔۔ رؤف خوشتر

50۔قطعاتِ تاریخ منیر سیفی

51۔ہزاری روزہ اقبال سلیم

53۔ کہانی ایک قلم کار کی صابر ادیب

55۔مجرب نسخہ منظور وقار

57۔افسانچے ایم۔اے۔احد، ساحر کلیم

غزلیات:۔

58۔شفیع اقبال، گوہر شیخ پوروی، مرغوب اثر فاطمی، محمد نوشاد نورنگ، حافظ کرناٹکی، ارشد قمر

59۔مسلم نواز، ڈاکٹر حبیب راحت حباب، ڈاکٹر قمر الزماں، راہی صدیقی، شفیق پروین، نسرین بانو نکہت

60۔محمد ہارون سیٹھ سلیم، حیرت فرخ آبادی، سید آصف دسنوی، محبوب اکبر، طاہر حسین طاہر، تبسم فرحانہ

61۔ علیم الدین علیم، یوسف آزاد، شہزاد اشرفی، غلام سرور ہاشمی شاہ نواز انصاری

62۔کتابوں کے شہر میں (تبصرے)

مبصرین۔مفتی غلام رسول رضوی، عبدالمتین جامی، سعید رحمانی

69۔طرحی مشاعرہ

70۔ادب پیما: ادبی و ثقافتی خبریں

72۔متفرقات

قاضی مشتاق احمد
B-6,Ray-venueSociety
I.C.SColony.GaneshKhind-411007

انٹرنیٹ کے زمانے میں اردو کتابی میلے: امید کی آخری کرن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے اشتراک سے مہاراشٹر کے صنعتی شہر بھیونڈی میں منعقدہ ۹روزہ کتابی میلے (۱۷رسے ۲۵ر دسمبر ۲۰۱۶) میں ایک کروڑ ۱۴رلاکھ ۵۵رہزار ۱۲ر روپے کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس حساب سے یہ اب تک کا سب سے کامیاب میلہ ثابت ہوا۔ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ نوٹ بندی بھی محبان اردو کے جوش وخروش پر روک نہیں لگا سکی۔ کتاب میلے میں ۱۲۱ر اسٹال لگائے گئے تھے جن میں ہندوستان کے اہم ناشرین شامل تھے۔ کتاب میلے میں ادب، مذہب اور تاریخ کی اہم کتابیں برائے فرخت اسٹالز پر رکھی گئی تھیں۔ بڑی تعداد میں طلبہ، والدین، اساتذہ اور عمائدین شہر کے علاوہ ریاست کے دیگر شہروں کے محبان اردو اپنی پسند اور دلچسپی کی کتابیں خریدرہے تھے۔ نوٹ بندی کے پیش نظر بعض کتاب فروشوں نے سوائپ مشینیں بھی لگائی تھیں لیکن اس کا استعمال کم ہی ہورہا تھا۔ جب کہ آخری دن تو گویا خریداروں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ میلہ کے کنوینر امتیاز خلیل نے میلے میں کتابوں کی فروخت اور بچوں کی حاضری کے متعلق انتہائی جذباتی انداز میں کہا کہ ''بیشتر لوگوں کو شکایت تھی کہ میلے میں بچوں کی کثرت ہے تاہم جب ذہنوں کی گرد چھٹے گی تو معلوم ہوگا کہ ہم اس میلے کے توسط سے ۲۰ر برس کا قاری چھوڑے جارہے ہیں جو زندگی بھر آپ کے ساتھ وفادار رہے گا۔'' اس میلہ کی زبردست کامیابی سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ تدریس میں ٹیکنالوجی پر مکمل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ کتابوں کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ اس میلہ میں ثقافتی پروگراموں کے انعقاد اور اردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل پر گفتگو اور دانشوروں کی شمولیت نے اس کی افادیت میں اور اضافہ کیا ''اردو ذریعۂ تعلیم میں معیار کا مسئلہ اور ہماری ذمہ داریاں'' ''سول سروس میں اردو طلبہ کے لئے مواقع'' جیسے موضوعات پر ماہرین نے سیر حاصل گفتگو اور شرکاء کے سوالوں کے اطمینان بخش جوابات دیے۔ ایک کامیاب پینل ڈسکشن بھی ہوا۔

ثقافتی پرگرموں میں راقم الحروف کے تحریر کردہ دو بابی اردو ڈرامے ''آزاد کا خواب: ہندوستان کی آزادی'' (مولانا آزاد کی حیات، خدمات اور ان کی ذاتی زندگی پر مبنی) اور ایک مونولاگ ''غالب سفر میں'' کو بے حد پسند کیا گیا۔ ڈراما شروع ہونے سے قبل ہی انیس ہائی اسکول کا کیمپس محبان اردو سے بھر گیا جن میں خواتین کی اکثریت تھی۔ شائقین نے دونوں ڈرامے بہت پسند کیے اور تالیوں کے ذریعہ اداکاروں کا حوصلہ بڑھایا۔ دلچسپ بات یہ کہ ان دونوں ڈراموں میں جوہر دکھانے والے اداکار غیر اردوداں تھے جنھیں مشہور ہدایت کار مجیب خان نے اردو زبان کا تلفظ صحیح سکھایا تھا اس لئے ان کا تلفظ صحیح تھا۔ ڈراموں کے پُراثر سین اور زبردست مکالموں نے سماں باندھ دیا۔ خصوصاً مولانا آزاد کا کردار ادا کرنے والے بندیل کھنڈی اداکار یکتار تھ شری واستو نے اپنی اداکاری اور بہترین ڈائیلاگ ڈیلوری سے لوگوں کا دل جیت لیا۔ جب نہایت عزت واحترام کے ساتھ بحیثیت ڈراما نگار راقم کا تعارف مجیب خان نے کرایا تو بڑی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ میں اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا انعام سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد مجیب خان صاحب نے مشہور شاعر بیکل اُتساہی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کتاب میلہ کا افتتاح مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل پرکاش جاوڈیکر نے کیا۔ پرکاش جاوڈیکر کا تعلق مہاراشٹر کے آکسفورڈ اور مشرقی ہندوستان کے علی گڑھ کہلانے والے علمی شہر پُونے سے ہے۔ زعفرانی پارٹی سے متعلق ہونے کے باوجود ان کے مراسم اقلیتوں کے ساتھ بھی خوشگوار ہیں۔ بھیونڈی کے اس کامیاب ترین اردو میلہ کی رونق اور کامیابی کو دیکھ کر وہ یقیناً متاثر ہوئے ہوں گے۔ انھیں اس بات کا احساس بھی ہوگیا ہوگا کہ اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نام ہے۔ یہ مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ پورے ملک کی زبان ہے۔ دنیا میں ۶۸۰۰ر زبانیں ہیں اور ۴۲ر ہزار لہجہ میں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں اردو زبان کا پانچواں نمبر ہے۔ اگر وہ ڈراما ''آزاد کا خواب'' کے غیر اردوداں اداکاروں کے صحیح وشستہ تلفظ کو سن لیتے تو انھیں اس بات پر یقین آجاتا کہ اردو زبان سیکھنے میں آسان ہے۔ اور اس زبان کے ذریعہ عوام الناس تک رسائی ممکن ہے۔ میلہ کے اختتامی اجلاس میں کونسل کے ڈپٹی ڈائریکٹر کمل سنگھ نے اردو کے قارئین سے التماس کی کہ وہ ہمیں اس زبان کے فروغ کے متعلق مشورے دیں جنھیں ہم مارچ، اپریل میں منعقد اعلیٰ سطحی میٹنگ میں وزرات کے سامنے پیش کریں گے۔ اس سلسلے میں میرا

مشورہ یہ ہے کہ کونسل زیادہ سے زیادہ تعداد میں ملک کے دور دراز مقامات پر بھی اردو میلوں کا اہتمام کرے۔ اردو کتابیں دور دراز مقامات پر مہیا نہیں ہیں۔ کتابوں کے قارئین میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے جنھیں اردو کتابوں کی کمیابی کی شکایت ہمیشہ ہوتی ہے۔ بھیونڈی کے اردو میلہ میں ایک دن خواتین کے لئے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس دن خواتین نے

مقررہ وقت میں ۱۴ر لاکھ ۳۶ ر ہزار ۴۰ ۳ ر روپے کی اردو کتابیں خرید کر یہ ثابت کر دیا کہ زبان سے محبت کے معاملے میں وہ بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ بھیونڈی جیسے مزدوروں اور محنت کشوں کی بستی میں یہ حال ہے تو پھر بھلا ان علاقوں میں کیا ہوگا جہاں خوش حالی ہے۔ میلہ ہرگز کامیاب نہ ہوتا اگر منتظمین نے اردو زبان وادب کا پیغام طلبا و طالبات کے ذریعہ دور دور تک نہ پہنچایا ہوتا۔ اس سلسلے میں اس علاقہ کے اردو اسکولوں اور کالجوں کے طلبا نے ریلیاں نکال کر شہریوں سے اس کتاب میلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی اپیل کی تھی۔ ریلی میں شریک طلبہ اپنے ہاتھوں میں متعدد پلے کارڈس لئے ہوئے تھے۔ جن میں اردو میں مختلف اشعار اور نعرے تحریر تھے۔ مثلاً

وہ کرے بات تو ہر بات سے خوشبو آئے۔ ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے

جب تک سورج چاند رہے گا' اردو تیرا نام رہے گا

منتظمین نے میلہ کے موقع پر طلبہ کی دلچسپی کے پیش نظر ثقافتی پروگرام' مذاکرے' شام غزل' اور ڈرامے منعقد کر کے گھروں میں بیٹھ کر ٹی وی کے سامنے وقت گزارنے والوں کو میلہ میں آنے کا سامان پیدا کیا۔ گلہ باز شاعروں کی بھیڑ جمع کر کے مجمع لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ صرف وقت اور روپے برباد ہوتا ہے۔ ان میں کچھ ایسے بھی پیشہ ور شاعر آجاتے ہیں جنھیں شراب پی کر اپنی اصلیت کا مظاہرہ کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی یا وہ شاعرات آجاتی ہیں جو کسی دوسرے شاعر سے غزل لکھوا کر لاتی ہیں اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ داد کے ساتھ نوٹ وصول کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ امید ہے کہ کونسل ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کرے گی۔ اردو زبان کی ترقی و بقا کی راہ میں بے مقصد سمیناروں کا جان لیوا مرض حائل ہے۔ پیشہ ور مقالہ نگار حضرات عوامی دلچسپی سے محروم موضوعات پر سمینار منعقد کر کے لوگوں کا وقت اور سرکار کا پیسہ ضائع کر رہے ہیں۔ یہ گروہ اب ''سمینار مافیا'' کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ ہم اس قسم کی ادب دشمن روایتوں سے چھٹکارا حاصل کریں اور ایسے حالات پیدا کریں کہ ہماری نئی نسل اردو کتابیں' رسائل اور اخبارات پڑھنے میں دلچسپی لے اور انٹرنیٹ کا استعمال بلاوجہ نہیں بلکہ ضرورت ہو تو کریں۔ ☆☆☆☆

اپنی بات

ادبی محاذ کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اس بات کا اعلان کرتے ہوئے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ نئے سال کے اس شمارہ سے ادبی محاذ اپنی اشاعت کے تیرھویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ یہاں تک پہنچنے میں ہمیں جن لوگوں سے حوصلہ ملا ان میں اولیت قارئین کرام کو حاصل ہے۔ ابتدا سے ہی قارئین دامے' درمے' سخنے ہمیں بھرپور تعاون دیتے آرہے ہیں جس کی بدولت رسالہ اب تک پابندی سے شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ادارتی بورڈ کے ممبران بھی ہر قدم پر ساتھ دیتے آرہے ہیں جو ان کی زبان وادب سے گہرے لگاؤ اور دلچسپی کا نتیجہ ہے۔ ادارہ ان سبھی معاونین کا صمیمِ قلب سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ ادھر چند شماروں سے اشاعت میں تاخیر ہونے لگی ہے جس کا واحد سبب گوشے کے لیے مضامین کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر شمارہ بھی آپ کو قدرے تاخیر سے ملا ہے۔ امید ہے ہماری مجبوریوں کے پیشِ نظر زحمتِ انتظار برداشت کریں گے۔ طرحی غزل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو رسالہ اگر تاخیر سے ملے تو اس کے ایک ہفتے کے اندر اپنی طرحی غزل بھیج سکتے ہیں۔

اس بار ڈاکٹر فریاد آزر صاحب کا گوشہ شامل ہے۔ موصوف ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ معتبر ادیب اور صحافی بھی ہیں۔ ان کی شاعری صحیح معنوں میں عصری حسیت کی آئینہ دار ہے جس میں انہدام پذیر معاشرے کی عکاسی بھی ہے تو کربِ ذات سے کربِ کائنات تک کی دھڑکنیں بھی سنی جاسکتی ہیں مگر ان سب میں نمایاں پہلو اپنے عہد کی سائنسی پیش رفت کی طرف مثبت رویہ اور اس کے جلو میں آنے والے نامعلوم خوف کا سایہ بھی تھرتھراتا نظر آتا ہے۔ یہ شعر تو موصوف کی پہچان بن چکا ہے:

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا۔ رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

اسی نوعیت کے ان گنت شعر ان کے یہاں مل جاتے ہیں جن سے ان کی سائنسی سوجھ بوجھ کا پتہ چلتا ہے۔ اس تیز رفتار عہد میں سکڑتی ہوئی زمین ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے اور وہ صحیح معنوں میں اس گلوبل گاؤں کے نمائندہ شاعر ہیں۔ مختصر یہ کہ گزشتہ نصف صدی کے اندر ڈاکٹر فریاد آزر صاحب نے جو گرانقدر ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ تاریخ کا حصہ بنی رہیں گی۔ ہم نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ یہ گوشہ موصوف کے شایانِ شان ہو۔ پھر بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ یہاں ان تمام محترم قلمکاروں کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہوں گا جن کی نگارشات سے یہ گوشہ مزیّن ہے۔

آخر میں تمام قارئینِ کرام کی خدمت میں نئے سال کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے ہماری دعا ہے کہ یہ سال سب کے لئے سکھ شانتی اور امن وسلامتی کا ضامن ہو اور خاص طور سے مشرقِ وسطیٰ میں جاری برادر کشی کا سلسلہ ختم ہو۔ اللہ تعالیٰ ان شدت پسندوں کو عقلِ سلیم عطا فرمائے اور وہ اپنے بھائیوں کا خون بہانے سے باز آجائیں۔ آمین

سید نفیس دسنوی

حمد و نعت

شمیم یوسفی
Ex-Postmastr-Mahalla Qazitola
NearSraiMasjid.At/Po-Ara(Bihar)

یکے انداز سے ہو کر بہ اندازِ دگر ہونا
اشارے پر ترے قائم یہ شام اور یہ سحر ہونا
ہمیں بھی یاد ہے اہل جہاں بھی یاد رکھتے ہیں
کبھی بیمار ہو جائیں تو تیرا چارہ گر ہونا
ترے درسِ محبت سے ہیں خود آگاہ دنیا میں
وگر نہ سخت مشکل تھا' یہاں اپنی خبر ہونا
ترے علمِ عطا کردہ سے ہم نے وسعتیں پائیں
کہاں تجھ کو گوارا تھا ہمارا مختصر ہونا
ترے ہی قرب کی دولت سے سب کچھ کرلیا ہم نے
بڑا اعزاز تھا دشمن کے نیزے پر یہ سر ہونا
شمیمؔ یوسفی نے راز افشا کر دیا' لیکن
تجھے کیا زیب دیتا ہے کسی کا پردہ در ہونا

ڈاکٹر علی عباس امید
O1,StarResidency.IdgahHills
Bhopal-462001(M.P)

سر بہ سجدہ ہے قلم کیسے تمنا لکھوں
ماورئ فکر کی حد سے ہے تجھے کیا لکھوں
ابتدا' وقت کی حد' صبحِ ازل' شامِ اودھ
حق تو یہ ہے کہ میں کچھ ان کے علاوہ لکھوں
لا میں تو مخفی ہے تیری ہے خبر الاّ اللہ
صفحۂ حال پہ ماضی کو میں فردا لکھوں
آسماں سمت' زمیں' ذہن' خطا اور عطا
پہلے ان سب کو پڑھوں پھر تجھے تنہا لکھوں
حرف بھی تو ہے' عبادت بھی ترے نور کا عکس
پھر بھی گمراہ ہوں گر تجھ کو صحیفہ لکھوں
میں کہ عاصی ہوں طلب آخری منزل میری
تو کہ رحمت ہے تجھے کیسے نہ وعدہ لکھوں
مجھ کو احساس ہے کوتاہیِ فن کا امیدؔ
اور کچھ لکھ نہیں سکتا ہوں تو سجدہ لکھوں

غلام مرتضیٰ راہیؔ (فتح پور)

کم جو مجھے حصہ دے
نادار کو پہنچا دے
منظر میں رہوں ہر دم
وہ ذوقِ نظارہ دے
اربابِ بصیرت سے
مٹی مری چھنوادے
دے راہ مجھے سادہ
پا نقش کنندہ دے
جتنی بھی ہو سچائی
سب مجھ سے اُگلوادے
مجھ کو جو دبا کر رکھ
بنیاد کا درجہ دے
ٹھوکر وہی راہیؔ کو
جو راستہ دکھلا دے

مہدیؔ پرتاپ گڑھی
۲۸۔اسکول وارڈ ،پرتاپ

وہ پیکر نور کے وہ کملی والے
قدم بوسی کریں جس کے اُجالے
جو آنکھیں دل کی کھولو اُن کو دیکھو
نبی کی عظمت و رفعت کو سمجھو
بڑے احسان ہیں ہم پر نبیؐ کے
کہ قرباں جائیں ہم اور اُن کے صدقے
شریعت پر عمل جو کرلے اُن کی
تو سیرت اُس کی ہو صدیقؓ جیسی
وہ رحمت اور سخاوت کے سمندر
نہیں اُن سا ہے کوئی غُربا پرور
درود اُن پر پڑھو ہر آن مہدیؔ
کرو قربان اُن پر جان مہدیؔ

انجم باروی
آئی۔۹۲/رامیشور پور روڈ۔کولکاتا۔۷۰۰۰۲۴
موبائل۔8100116443

خوشبو سے معطر جو مدینے کی زمیں ہے
در اصل وہ ہم رتبۂ عرشِ بریں ہے
فرمان نبیؐ میں تو وہ مومن ہی نہیں ہے
جس شخص کو جنت کا نہ دوزخ کا یقیں ہے
اس پیکرِ انوار کی توصیف کروں کیا
آئینہ بھی شرمندہ ہے وہ روئے حسیں ہے
کفّار بھی سارے یہی کہتے تھے ہمیشہ
ہر قول ترا صدقِ تو صادق و امیں ہے
کیا ہم سے بیاں سیرتِ محبوب خدا ہو
توصیف میں جب صفحۂ قرآنِ مبیں ہے
انجمؔ ہے سہارا مجھے اس ماہ ھدیٰ کا
وہ شافع محشر وہی سرورِ دیں ہے

شمسی قریشی
Moh:Usmanpur,Post,Jlalpur
Dist,Ambedkar(U,P)

رکھ جبیں رب کا تو ہوجا رَبّیِ الاُعلیٰ کے ساتھ
کثرتِ صلِّ علیٰ سے جُڑ شہِ بطحا کے ساتھ
آحریمِ ناز میں آدیدۂ بینا کے ساتھ
کر نظارہ جلوۂ حق کا رُخِ زیبا کے ساتھ
حُسنِ مہ صدقہ ہے صدقہ حُسنِ آقا کا مرے
چاند کو کیا رکھ کے دیکھوں میں رُخِ زیبا کے ساتھ
آمنہ کا بدرِ کامل اور صحابہ کا ہجوم
چرخ سے اک چاند اُترا فرش پر ہالہ کے ساتھ
مستقل ایذا رسانی' گالیاں پھر بھی دعا
اللہ اللہ آپ کا حُسنِ عمل اعدا کے ساتھ
گُم ہوں شمسیؔ عالمِ مدحِ نبی میں ہر نفس
رہ کے بھی دنیا میں' میں رہتا نہیں دنیا کے ساتھ

محسن باعشن حسرت
۴/ پرنسپ اسٹریٹ۔سکنڈ فلور۔کولکاتا۔۷۲

خیالِ مصطفیٰ دل سے نہ اک پل بھی جدا ہوگا
زباں پر ہر گھڑی نامِ محمد مصطفیٰ ہوگا
ہوا ہے آپ سا کوئی نہ ہوگا دوسرا کوئی
بروزِ حشر بس اک آپ کا ہی آسرا ہوگا
مدینے میں مجھے بھی یا رسول اللہ بلا لیجے
وہاں ہر ہر قدم پر ایک اک سجدہ ادا ہوگا
زباں پر یا محمد کی رہے گی رٹ ہمیشہ ہی
بوقتِ نزع ہونٹوں پر مرے صلِّ علیٰ ہوگا
بیاں عظمت محمد کی کروں میں کس طرح حسرتؔ
مرے الفاظ سے کیسے بھلا یہ حق ادا ہوگا

حمد و نعت

ظفر اقبال ظفر
170,Kheldar-Fatehpur,(U.P)

مرے اللہ ایسا مقدّر ہو جائے
بند آنکھیں جو کروں طیبہ کا منظر ہو جائے
جوانؐ کے نام کی خوشبو ہے مری سانسوں میں
کاش آقا کو مرے دل کی خبر ہو جائے
اس کی آنکھوں کی بصیرت میں کمی ہوتی نہیں
گنبدِ خضریٰ پہ جس کی بھی نظر ہو جائے
گھر سے نکلا ہوں میں صل علیٰ پڑھتے ہوئے
میری آنکھوں میں گھٹا کوئی سحر ہو جائے
ایسی قسمت مرے اللہ بنا دے تو مری
شب ہو مکّے میں تو طیبہ میں سحر ہو جائے
میرے مولا مرے اعمال بنا دے ایسے
لب سے جو نکلے دعا پوری ظفرؔ ہو جائے

فہیم انور
11,Seal Bustee 2nd Bye lane
Dist:Howrah,711102(W.B)

اے نیّرِ حق ہم دکھیوں کی قسمت کا ستارہ چمکانا
شاہوں کی جہاں جھکتی ہے جبیں اس در پہ ہمیں بھی بلوانا
ہم اہلِ وفا ہیں اہلِ وفا احسان نہ اُن کا بھولیں گے
اُمّت کی شفاعت کی خاطر اشکوں کے گہر کا چھلکانا
سرکار کی جیسی کیا کوئی تعظیم کرے گا عورت کا
اُٹھ جانا حلیمہؔ کی خاطر دستار بچھانا بیٹھانا
کرتا ہے خدا جن کی مدحت توصیف کرے کیا اُن کی کوئی
سرکارِ دو عالم کا رتبہ دنیا میں بھلا کس نے جانا
مدّاح تمھارے ہیں آقا، محشر میں کرم اتنا کرنا
ہم تشنہ دہن کے ہونٹوں پر کچھ قطرۂ کوثر ٹپکانا
یہ طرزِ ادا اس کی انورؔ بے شک ہے پسند اللہ کو بھی
لکھتے لکھتے نعتِ اقدس سجدے میں قلم کا گر جانا

قدیر احمد قدیرؔ
**Naved mnzil,Krishna
Colony,Hulkoti,582205**

نُورِ مُبیں ہیں آپؐ سراپا رسولِ پاکؐ
قرآن آپؐ کا ہے قصیدہ رسولِ پاکؐ
ارفع ہے کس قدر شبِ اسریٰ رسولِ پاکؐ
دیکھا خدا کا آپ نے جلوہ رسولِ پاکؐ
رطبُ اللسان گزرے، کئی نعت گو مگر
سیرت کا کر سکا نہ احاطہ رسولِ پاکؐ
دُرِّ یتیم آپؐ سہارے یتیم کے
بے کس پناہ، ملجا و ماویٰ رسولِ پاکؐ
آئے ہیں یوں تو لاکھوں نبی اس جہان میں
"کوئی نہیں ہے آپ کے جیسا رسولِ پاکؐ"
اس بندۂ قدیرؔ کی ہے آرزو یہی
چومے نظر سے آپ کا روضہ رسولِ پاک

مقبول منظرؔ
Muslim Nager Daltonganj
Palamu(Jharkhand)822101

ملی جو مجھ کو محمد کے نام کی خوشبو
اُسی کا فیض ہے میرے کلام کی خوشبو
وہ ذات وصفِ محمد سے ہوگئی معمور
جو پائی اس نے نبی کے غلام کی خوشبو
جو رند ہو گا محمد کے نام کا، ان کی
ملے گی حشر میں کوثر کے جام کی خوشبو
حبیبِ رب جنھیں بھیجیں گے باغِ جنت میں
ملے گی ان کو معطر مقام کی خوشبو
جہاں سے جائیں گے لے کر جو گل ثوابوں کے
انھیں کو حق سے ملے گی مدام کی خوشبو
بفیضِ نعتِ نبی فخر امیں کا ہے منظرؔ
ملی جو مجھ کو خود اپنے کلام کی خوشبو

ظہیر احمد گلبر گوی
گلبرگہ، کرناٹک

کس کو مطلوب ہے کونین کی دولت سرکارؐ
دل میں آباد رہے آپؐ کی الفت سرکارؐ
کام آتا ہے جو مشکل میں سدا انساں کے
اس کو حاصل ہے عجب دولت و عزت سرکارؐ
آپؐ کا ذکر فقط آپؐ کی تعریف نہیں
آپؐ کا ذکر تو ہے رب کی عبادت سرکارؐ
آپؐ کے نقشِ قدم پر جو چلے دنیا میں
اس پہ ہوتی ہے سدا آپؐ کی رحمت سرکارؐ
ایک مدت سے ہے بس اتنی تمنائے ظہیرؔ
درِ اقدس کی مُیسّر ہو زیارت سرکارؐ

مختار احمد کوثر
C-66 کریلی الہ آباد

زبانِ عجز پر جب بھی درود آیا سلام آیا
مدینہ سے عطّیہ برکتوں کا میرے نام آیا
رسولِ پاک ہی تفسیر ہیں اِن تیس پاروں کی
کہ اس قرآن کے اندر حیاتی اک نظام آیا
دہکتی ریت سے اُٹھتی کراہیں یہ بتاتی ہیں
کہ آقا کی غلامی میں 'بلال' ایسا غلام آیا
مرے اُمّی لقب آقا مخالف تو کئی آئے
مگر وہ فکر و ذکر آیا، نہ وہ طرزِ کلام آیا
ابو بکر و عمر فاروق، عثمان و علی حیدر
نبی کے بعد بالترتیب ان چاروں کا نام آیا
کہا اقبالؔ نے کیا خوب مصرع ہم مسلماں پر
"کہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا"
محمدؐ کی غلامی سے ہوا قابو میں امّارہ
بڑی مشکل سے کوثرؔ باز دل کا زیر دام آیا

گوشۂ احباب

(مراسلہ نگار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں)

☆**سید اسلم صدا آمری (چنئی)** جولائی تا ستمبر کا ادبی محاذ گوشۂ کبیر وارثی کی صورت میں ہمدست ہوا۔ محاذ اول میں قاضی مشتاق احمد نے افغانی صابر حسین کی علمی و ادبی موبائیل لائبریری سے روشناس کراتے ہوئے ''کاش ہمارے یہاں کوئی صابر حسین ہوتا'' جو آہ بھری ہے وہ بے حد دل آ گیں ہے۔ محاذ ثانی میں سمیع الحق شاکر نے ''گوشۂ کبیر وارثی'' میں اپنا اجمالی خاکہ پیش کیا ہے۔ اس گوشہ میں کبیر وارثی کے شعری مجموعہ ''شہر محبت'' پر سعید رحمانی، رفیق شاہین، شارق عدیل، صابر ادیب اور عبدالمتین جامی جیسے معتبر اہل قلم نے اپنے رشحات قلم سے جو تبصرے قلم بند کیے ہیں وہ شاعر شہر محبت کبیر وارثی کے لئے ایک معتبر دستاویز و سند سے کم نہیں۔ حمد و نعت کے کالم میں احقر کی نعت کو جائے اشاعت نصیب ہوئی جس کے لئے میں مشکور ہوں۔ استاذِ سخن قمر سنبھلی کی نعت کیف آور اور وجد آور ہے۔ غلام مرتضیٰ راہیؔ کی مناجات کے آخر کے دو شعر ماورائے فہم ہیں۔ البتہ ان کی غزل کا یہ شعر

بوجھ سے جھکتی ہوئی شاخ کو غم سے لے کر پھول بھی مری طبیعت پہ گراں بار ہوا

بہت پسند آیا۔ رؤف خیر نے اپنی غزل کے مقطع میں اپنے نام اور تخلص سے استفادہ کرتے ہوئے۔

وہ ضد میں آپ ہی اپنے خلاف جاتا ہے۔ رؤف خیرؔ کو ہر اعتبار شر سے ملا

خود کو جو متعارف کرایا ہے، قابل داد و تحسین ہے۔ حیرتؔ فرخ آبادی کی غزل کے مطلع میں ردیف کمپوزنگ کی غلطی سے ''پہلے'' کی جگہ ''اپنا'' شائع ہو گیا ہے۔ اشوک مزاج کی غزل، غزل کے مزاج سے میل نہیں کھاتی جس کو کمپوزنگ کی نذر تو نہیں کہا جا سکتا۔ قدیر احمد قدیرؔ کی غزل بحر خفیف میں اچھی لگی۔ تبسمؔ فرحانہ نے بھی چھوٹی بحر میں اچھی کوشش کی ہے۔ وہیں کہنہ مشق شاعر اختر کاظمی صاحب کی بھی چھوٹی بحر میں کہی گئی غزل قابل احترام ہے۔ آصف دسنوی نے بھی چھوٹی بحر میں بڑا کمال کیا ہے۔ ظفرؔ اقبال ظفر کا مقطع پسند آیا۔

تھی سر سے کھیلنی جو عادت اُسے ظفرؔ اس کی انا پہ وار تو میں نے کیا نہیں

لئیق خان کوثرؔ، شاہد سیانوی، ڈاکٹر رام داس اور ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی کی غزلیں بھی قابل داد و تحسین ہیں۔ اس کے علاوہ علیم صباؔ نویدی نے اپنے ''نثری نظم'' میں، گوپی چند نارنگ کے مضمون (مطبوعہ ''اوراق''، اکتوبر، نومبر ۱۹۸۵ء) بعنوان ''نثری نظم کی شناخت'' کے حوالے سے وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسی مقتدر شخصیتوں پر فوقیت حاصل کرنے کی ایک کارگر کوشش ضرور کی ہے، لیکن ایم احدؔ جیسے کئی اردو قارئین کے لئے قابل قبول بھی ہو ورنہ یہ سعیٔ بے سود ہے۔ علیم صباؔ نویدی جو بقول ناوکؔ حمزہ پوری تملناڈ کے بابائے اردو اور بقول رؤف خیرؔ خواجۂ ادب نواز ہیں نے گوپی چند نارنگ کے مضمون ''نثری نظم کی شناخت'' کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ نثری آہنگ کی تفہیم میں صوتیات سے تعلق رکھنے والی اصطلاحات:

(۱) طول ۲) Quanitity) بل ۳) Strees) سر لہر Intonation کو بہت اچھے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے جس کے بعد یہ بات فوراً داخلِ دماغ ہو جاتی ہے کہ کسی بھی نثری تحریر یا عبارت یا جملوں کی ترکیب کو زبان سے گھسیٹ کر، طول دے کر، کہیں کہیں درمیان میں بل دے کر، بل کر لحن انداز یا راگ میں الاپا جا سکتا ہے اور اس کو نثری نظم کا نام دیا جا سکتا ہے مثلاً، یہ فن بعض واعظوں اور مقرروں میں دیکھا گیا ہے جو اپنی تقریر یا واعظ کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والوں کے دل و دماغ کو دوہا، گیت یا نظم کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے۔ لفظ ''نظم'' ہی اپنی جگہ صنفی اعتبار سے وزن اور بحر کے دائرے میں رہنے کی دلالت کرتا ہے۔ رہا اردو شاعری، اس میں پہلے بھی تجربے ہوئے اور اب بھی ہوتے آ رہے ہیں، آئندہ بھی اس کے امکانات ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان تجربات کو آزاد نظم، آزاد غزل، دوہا غزل یا غزل نما جیسی پذیرائی حاصل ہو اور اردو کے معتبر قاری انھیں تسلیم اور قبول کر لیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے نثری نظم کو نثری نظم کی بجائے نثری شاعری یا غزل نما کی طرح ''نظم نثری''، ''نثری نما نظم'' کا نام دے دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ خط طویل ہو گیا ہے، آمدم برسرِ مطلب ایک تازہ غزل ارسالِ خدمت ہے۔

☆**ضیا جعفر (بنگلور)** اکتوبر دسمبر کا شمارہ پڑھا اور پڑھتا رہا۔ قاضی مشتاق صاحب کا طنزیہ ''کیا یہی راج دھرم ہے'' کافی فکر انگیز ہے اور کئی واقعات کی صحیح تصویر کشی کرتا ہے۔ گوشۂ سید شکیل دسنوی'' میں قاضی رؤف انجم، ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی، منیر سیفی، شارق عدیل، ابرار نغمی، سید نفیس دسنوی، مدہوش بلگرامی، نصر اللہ نصرؔ احسن امام احسن، محب الرحمان وفاؔ اور ارشد قمر صاحبان جیسی قد آور شخصیتوں نے موصوف کے فکر و فن کا عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔ علیم صبا نویدی، منیر سیفی اور سعید رحمانی کا پیش کردہ نذرانۂ عقیدت پسند آیا۔ اس میں شکیل صاحب کی غیر مطبوعہ تخلیقات بھی شامل کر کے آپ نے انھیں زندگی بخش دی ہے۔ مجموعی طور پر یہ گوشہ دستاویزی بن گیا ہے۔ صبیحہ جہاں نے اپنے مضمون ''رؤف خوشتر کی کائناتِ طنز و مزاح'' کے ذریعہ موصوف کی طرزِ تحریر پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ میرے افسانہ ''اور منظر بدل گیا۔۔۔'' کو قارئین نے کافی سراہا ہے۔ میں ان سب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ پروفیسر مناظر عاشق صاحب کے افسانہ ''لہولہان وقت'' میں میری کہانی نظر

آئی۔ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ گزر چکا ہے۔یہ افسانہ پڑھ کر میری آنکھیں نم ہوگئیں۔حسن ساہوٗ ایس۔کیو عالم طلعت اور سید فرید دسنوی کی مختصر مختصر کہانیاں طنز سے بھر پور ہیں۔غزل کا حصہ اس بار بھی بھاری اور سبھی غزلیں اور مضامین متاثر کرتے ہیں۔قارئین کے خطوط بھی پسند آئے۔

☆**منیر سیفی**(پٹنہ) ادبی محاذ برائے اکتوبر دسمبر باصرہ نواز ہوا۔قاضی مشتاق احمد کا "محاذِ اول" کو دوٹوک کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔میں نے محسوس کیا کہ حضرت سید شکیل دسنوی (مرحوم) کے شایانِ شان گوشہ نہیں نکل سکا ہے۔سید نفیس دسنوی نے "محاذِ ثانی" میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے عبدالمتین جامیؔ کے "مونسِ سخن" پر مہدی پرتا بگڑھی کے تاثرات پسند آئے۔حمید عکسی کے مطلع میں لفظ "سنگلاخ" اپنے تلفظ کے ساتھ ادا نہیں ہو رہا ہے۔

☆**عبدالحیٔ پیام انصاری**(گورکھپور) ادبی محاذ اکتوبر دسمبر کا شمارہ شکیل دسنوی (مرحوم) کی خوبصورت مسکراتی ہوئی تصویر کے ساتھ دستیاب ہوا۔ان کے ادبی شب وروز کی جھلکیاں تصویروں کی زبانی دیکھنے کو ملیں۔اس کے علاوہ فیضانِ ادب کی ۱۵ رسالہ ادبی خدمات بھی تصویروں کی زبانی معلوم ہوئیں۔گوشۂ شکیل دسنوی میں شامل مشمولات کے ذریعہ موصوف کی ادبی شخصیت اور ان کے کارناموں سے متعارف ہوا۔اتنا خوبصورت گوشہ شائع کرنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔یہی گوشہ ہی شمارے کا حاصل کہلانے کا مستحق ہے۔

☆**علیم الدین علیم**(کولکاتا) ادبی محاذ برائے اکتوبر تا دسمبر موصول ہوا۔ماشا اللہ بہت جاذب نظر اور صورت وسیرت سے پرکشش ہے۔سید شکیل دسنوی (مرحوم) کا گوشہ دیکھ کر مسرت ہوئی۔لیکن ان کی ادبی خدمات اور ہمہ جہت شخصیت کے اعتبار سے پورا رسالہ ان کے نام شائع ہوتا تو بے حد مسرت ہوتی۔اس لیے کہ ان کو کئی اصناف پر دسترس حاصل تھی۔سپرنٹنڈنٹ انجینیئر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوتے ہوئے بھی ان کی وابستگی نہ صرف ادبی اداروں سے رہی بلکہ صحافت سے بھی جڑے رہے اور تا حیات اردو زبان وادب کی خدمت اور اپنی شاعری کو سنوار نے نکھارنے میں منہمک رہے۔وہ اچھے شاعر کے علاوہ اچھے تنقید نگار اور مضمون نگار بھی تھے۔غزلوں کے علاوہ مختلف اصنافِ سخن پر انھوں نے کامیاب طبع آزمائی کی ہے اور خوب کی ہے۔ان کی شاعری میں ایک خاص رنگ ہے جو موصوف کو غالباً وراثت میں ملی ہے۔

ان کی غزلوں میں جذبۂ احساس کی ترجمانی، داخلی کیفیات، خارجی زندگی کے مسائل، عصر حاضر کا کرب اور محبت کا پیغام بھی ہے۔ان کی درجنوں تصنیفات منظرِ عام پر آکر دانشورانِ ادب سے شرفِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔انھیں گرانقدر ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف اکاڈمیوں اور ادبی تنظیموں نے انعامات سے بھی نوازا ہے۔میں تو کہوں گا کہ ان کی شعری ونثری تخلیقات نے اردو ادب کے ذخیرے میں جو بیش بہا اضافہ کیا ہے اس کی بدولت مرحوم اردو دنیا میں ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔بقول راقم الحروف ؎

موت آتی ہے چپکے سے جب سامنے۔ جانا پڑتا ہے اس کو چمن چھوڑ کر
تذکرہ اس کا ہوتا ہے پھر جابہ جا۔ جو بھی جاتا ہے حسنِ سخن چھوڑ کر

☆☆☆

آخری غزل

ظہیر غازیپوری (مرحوم)

(نوٹ: یہ غزل ہمیں ۲۹؍ اکتوبر ۲۰۱۶ء کو ملی۔ساتھ میں ان کی شاگردہ شفیق پروین کی غزل بھی تھی۔خط میں لکھا تھا کہ ہفتوں صاحب فراش رہنے کے بعد ذرا طبیعت سنبھلی تو بیٹھنے کے قابل ہو سکا۔اپنی غزل کے ساتھ شفیق پروین کی غزل بھی بھیج رہا ہوں۔انھیں خریدار بننے کے لیے کہہ دیا ہے۔وہ جلد ہی اپنا زرِ سالانہ ارسال کرنے والی ہیں۔اس کے تین دنوں بعد یعنی ۳؍ نومبر کو موصوف کے انتقال کی خبر سن کر دلی صدمہ ہوا۔وہ ایک مستند اور معتبر قلمکار ہونے کے علاوہ نہایت خلیق اور ادب پرور انسان بھی تھے۔ان کی رحلت بلاشبہ اردو زبان وادب کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ادارہ ان کے لواحقین کے اس غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔آمین)

کھینچو نئے گراف نئے دائرے بناؤ
اب بڑھ رہا ہے حد سے نئی فکر کا بہاؤ

میں ختم کر چکا ہوں تعاقب کا سلسلہ
کرنے لگے ہیں خود مرے الفاظ اب گھراؤ

ہم رشتہ جو نہ کر سکے لفظوں کو فکر سے
اب ان کو ضابطوں کے نئے آئینے دکھاؤ

پانی کا تیز ریلا نہ آئے خدا کرے
کچھ منچلوں کا ریت کے ٹیلے پہ ہے پڑاؤ

کب تک میں اپنے زخم کا مرہم بنا رہا
اب یاد بھی نہیں ہے کسی حادثے کا گھاؤ

بیٹھے ہوئے ہو لوگو! یہاں کیوں بجھے بجھے
موسم ہے بے مزہ تو لطیفہ کوئی سناؤ!

بے چہرگی کے دور میں پہچان کے لئے
احساس کی نظر کو ظہیرؔ آئینہ بناؤ

عبدالمجید فیضی
H.No:12/106,NayaPara
Sambalpur-768001(Odisha)
Mob:9778291038

خونِ ناحق

نہ لگائی کسی نے آگ اگر رہ گئے کیسے جل کے گھر کے گھر؟
نہ کوئی کشت و خوں نہ قاتل تھا خون آلود پھر بھی ہر منظر
ان گنت لاشیں ہر سو بکھری تھیں روح فرسا نظارہ تھا گھر گھر
سارے مقتول اپنے ہی قاتل؟ عقل پر سب کے پڑ گئے پتھر
کم تھا کب خوف اندھیری راتوں کا ہے جو دن کے اجالے کا بھی ڈر
ہم کو دیتے رہے دلاسا سب آنکھ جھپکی نہیں مگر پل بھر
کل جو شعلہ بیاں تھے تیغ بکف اب ہیں امن و اماں کے پیغمبر
آستینیں ہیں خوں سے تر جن کی ہیں وہی لوگ قوم کے رہبر
جو بھی تفتیش کرنے آتے ہیں حیرت انگیز ان کے ہیں تیور
کون سچ کہنے کی کرے جرأت؟ باندھ کر پٹی اپنی آنکھوں پر
تھے جو مظلوم ہیں وہی ملزم مدعی ہیں جو تھے ستم پرور
ہیں وہی لوگ منصفِ عادل خونِ ناحق ہے جن کی گردن پر
جن کو قانون کا لحاظ نہیں ان میں قانون ساز ہیں اکثر
ہم بچاتے ہیں خود ہی مجرم کو سارے الزام لے کے اپنے سر
اپنے ہی گھر میں جن کے چھوت اچھوت گائیں گُن ایکتا کے بڑھ چڑھ کر
دیکھیں میزانِ عدل کا پلّہ حق پہ مائل ہے یا کہ باطل پر
آسماں پر دماغ ہے فیضیؔ چرخ پیما ہیں فکر کے شہپر

محمد باعشن مغموم
2ndFloor.4,PrincepStreet
Kolkata-700072

خیر مقدم

انگبیں سے زیادہ میٹھی آپ کے قدموں کی چاپ
جیسے مغنی کا ترنم جیسے گانے کی الاپ
نقش ہے کانوں میں اب تک ایک اک قدموں کی چاپ
آپ میرے گھر میں آیے خیر مقدم آپ کا

آپ کے آتے ہی سارا گھر چراغاں ہوگیا
کونا کونا میرے گھر کا جیسے شاداں ہوگیا
ذرّہ ذرّہ پوچھتا ہے ''کون مہماں'' ہوگیا
آپ میرے گھر میں آیے خیر مقدم آپ کا

گھر میں پہلے ایسی ہلچل، ایسی رعنائی نہ تھی
نشّے میں ڈوبی ہوئی کوئی بھی انگڑائی نہ تھی
سر پہ یوں توبہ شکن کالی گھٹا چھائی نہ تھی
آپ میرے گھر میں آیے خیر مقدم آپ کا

خامشی کو توڑیئے منہ سے کچھ فرمایئے
ہجر کی راتوں کے قصے اور مت دہرایئے
بھول کر سارے گلے میرے گلے لگ جایئے
آپ میرے گھر میں آیے خیر مقدم آپ کا

کرشن پرویز
Kharar.Dist:Mohali
Punjab-140301
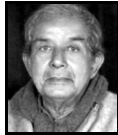
تضمین بر غزل جناب مہندر پرتاپ چاندؔ

''کوئی جنبش کوئی تدبیر کارگر ہی نہیں''
کسی بھی بات کا لیڈر پہ کچھ اثر ہی نہیں
کہیں کلرک کہ افسر ملے نہ دفتر میں
''کوئی بھی شخص اب اپنے مقام پر ہی نہیں''
سہارا جھوٹ کا لینے لگا ہے ہر لیڈر
''کسی زباں پہ کوئی حرفِ معتبر بھی نہیں''
تمیز اچھے برے کی کہاں الیکشن میں
''پرکھنے والی وہ بے باک اب نظر بھی نہیں''
بکیں گے ووٹ الیکشن میں جب بھی آئیں گے
''کبھی یہ ختم بھی ہوگا یہ وہ سفر بھی نہیں''
یہاں کرے جو حقیقت کو روبرو پرویزؔ
''بھرے جہاں میں کوئی میرا ہم سفر بھی نہیں''

ابرار نغمی
NearMohammadiMasjid
Raisen-464551(M.P)

ترائیلے

عصری ضرورت

رقص شعلوں کا سر پہ جاری ہے
خرمنِ زندگی بچانا ہے
یہ تو ہم سب کی ذمہ داری ہے
رقص شعلوں کا سر پہ جاری ہے
دوستو! وقتِ جاں نثاری ہے
عزم و ہمت کو آزمانا ہے
خرمنِ زندگی بچانا ہے

حسنِ بے پناہ

سب ترے حسن کا یہ جادو ہے
ہوش کھو بیٹھے اپنے بیگانے
تیری زلفوں کی پھیلی خوشبو ہے
سب ترے حسن کا یہ جادو ہے
برگِ گل میں جو رنگ اور بو ہے
راس آیے جنوں کو ویرانے
سب ترے حسن کا یہ جادو ہے
ہوش کھو بیٹھے اپنے بیگانے

ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی عزیزؔ
KaliPaltan.NearDiwanjiKaKuwan
Tonk-304001(Rajasthan)

تری دید کا ہے یہ آستاں

تری دید کا ہے یہ آستاں، تری پیت کا ہے یہ گلستاں
تری چاہ کا ہے یہ آشیاں، ترے واسطے میرا پیار ہے
تری نسبتوں سے قرار ہے، تری محفلوں سے بہار ہے
تری قربتوں سے نکھار ہے، ترے واسطے میرا پیار ہے
ترے جوش میں بھی جمال ہے، ترے ہوش میں بھی خیال ہے
تری سوچ میں بھی سوال ہے، ترے واسطے میرا پیار ہے
تو لطافتوں کا ظہور ہے، تو خمارِ ہستی کا نور ہے
تو جہانِ رنگ کا نور ہے، ترے واسطے میرا پیار ہے
تو کلی ہے شاخِ حیات کی، تو ضیاء جہانِ ثبات کی
تو ہے مے خمارِ حیات کی، ترے واسطے میرا پیار ہے
تو ہے سلمٰی لیلئِ شب کی، تو ہے لیلیٰ شمعِ حیات کی
تو ہے عذرا شعرِ حیات کی، ترے واسطے میرا پیار ہے
تو زبان و دل کی امین ہے، تو قرارِ دل کی رہین ہے
تو دھڑکتے دل میں مکین ہے، ترے واسطے میرا پیار ہے
تری یاد سے مجھے کام ہے، ترے جام سے مرا جام ہے
ترے نام سے مرا نام ہے، ترے واسطے میرا پیار ہے
تجھے دیکھ دیکھ کے ہوں فدا، ترے پاس آ کے بھی ہوں جدا
تو عزیزؔ ہے مجھے یوں سدا، ترے واسطے میرا پیار ہے

ڈاکٹر مسعود جعفری
Shaikpet Hyderabad

جنگ حل نہیں

یہ دھواں دھواں سا کیسا ہے
پربتوں میں یہ آنچ کیسی ہے
یہ بدیسی ہے یا کہ دیسی ہے
یہ تو اک موت ہی کے جیسی ہے
ایسا لگتا ہے سب کھنڈر ہوگا
کوئی سایہ نہ اک شجر ہوگا
کوئی گر جانہ اک گجر ہوگا
جنگ سے جیت ہو نہیں سکتی
یہ زمیں بوجھ ڈھو نہیں سکتی
کہاں انسانیت اماں لے گی
اپنی بانہوں میں آسماں لے گی

ڈاکٹر سید مظفر عالم ضیا عظیم آبادی (پٹنہ)

نیا سال

آیا ہے نیا سال مگر سوچ رہے ہیں
اب دل میں نہیں اپنے وہ پہلی سی امنگیں
خوشیاں جو مناتے تھے ترے آنے پہ ہم بھی
مایوسیاں کیسی ہیں بھلا خوف ہے کیسا
دامن میں لیے اپنے تو آیا ہے بتا کیا
وہ تلخ تجربات ہیں ان پچھلے دنوں کے
لاشوں کے وہ انبار تڑپتے ہوئے بچے
چیخیں مرے کانوں میں ابھی گونج رہی ہیں
ان سسکیاں لیتی ہوئی ماؤں کا تصور
جاتا ہی نہیں دل سے کبھی آہ! ہمارے
اب تو ہی بتا ہم ترا استقبال کریں کیا
کیسے تری آمد پہ بھلا خوشیاں منائیں
اک آس کی قندیل مگر اب بھی ہے روشن
چھٹ جائیں گے گھنگھور یہ بادل بھی کسی دن
چمکے گا نئی صبح کا خورشید کسی دن
ہوجائے گا دنیا میں اجالا ہی اجالا

ارشد میناںگری
Mominpura.51,Malegaon
Dist:Nasik-423203

پدم شری بیکل اتساہی کی رحلت پر

ریشم غزل کا گیت کا مخمل چلا گیا
نزدیکیوں سے دیکھتا رہتا تھا دوریاں
رکھتا تھا لفظ لفظ میں نغموں کی دلکشی
فکرِ سخن کی بیکراں، بیتاب پیاس پر
سرمست گونجتا ہوا سرشار ترنم
رکھی بہر لحاظ تقدس کی آبرو
ارشدؔ کرم کرے گا، خدا تو کریم ہے

کل دے کے اس جہان سے بیکلؔ چلا گیا
صدیاں تھیں جس کی فکر میں وہ پل چلا گیا
شعر و ادب کی آنکھ کا کاجل چلا گیا
ہر وقت برستا ہوا بادل چلا گیا
سانسوں کا مہکتا ہوا صندل چلا گیا
لفظوں کی حیا، فکر کا آنچل چلا گیا
مولا کی بارگاہ میں بیکلؔ چلا گیا

گوشۂ ڈاکٹر فریاد آزر

سوانحی پس منظر

ڈاکٹر فریاد آزر (سید فریاد علی) دس جولائی انیس سو چھپن کو بنارس ضلع کے غوثیہ ٹاؤن میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد الحاج سید عبدالحق قادری قالین کے ایک اہم تاجر تھے، لیکن فریاد آزر کی اعلا تعلیم کی تشنگی انھیں انٹرمیڈیٹ کے بعد 1972 میں دہلی کھینچ لائی۔ انھوں نے دہلی یونی ورسیٹی سے بی اے، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم اے اور بی۔ ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں اور جواہر لال نہرو یونیورسیٹی سے ماس کمیونیکیشنس میڈیا کا ایڈوانس ڈپلومہ حاصل کیا اور پھر آخر میں جامعہ ملیہ سے ہی ''اردو اور ہندی کی رومانی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھا۔

فریاد آزر نے شاعری کی الف بے بنارس میں وہاں کے مقبول شاعر ساجن پردیسی سے سیکھی تھی لیکن جامعہ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس سلسلہ میں ان کا ہاتھ ڈاکٹر عنوان چشتی کے ہاتھ میں دے دیا اور صحیح معنوں میں فریاد آزر کی شاعری کا آغاز جامعہ ملیہ سے ہی ساتویں دہائی کے اواخر سے ہوا۔ ابتدا سے ہی وہ برصغیر کے اہم ترین رسائل شاعر، شب خون، آہنگ، ادب لطیف اور افکار میں کثرت سے شائع ہونے لگے۔ اسی عہد میں ہی ان کی شاعری کے تیور کو دیکھ کر انھیں ''نئی غزل کا اینگری ینگ مین'' کہا جانے لگا۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''خزاں میرا موسم'' 1994 میں شایع ہوا۔ اسکول کے چھوٹے بچوں کی قربت میں ان کی فی البدیہہ شاعری کا مجموعہ ''بچوں کا مشاعرہ'' دہلی اردو اکادمی کی طرف سے 1998 میں شایع کیا گیا اور پھر اس کا دوسرا ایڈیشن بھی دہلی اردو اکادمی نے شائع کیا۔ ان کی غزلیہ شاعری کا دوسرا مجموعہ ''قسطوں میں گزرتی زندگی'' 2005 میں شایع ہوا۔ ان کی غزلوں کا انتخاب ''کچھ دن گلوبل گاؤں میں'' 2009 میں شایع ہوا اور اس کتاب کو دہلی اردو اکادمی نے 2010 میں اعزاز سے بھی نوازا۔ عنقریب ان کی غزلوں کا تیسرا مجموعہ ''اے لیئن'' یعنی دوسرے سیارے کا آدمی منظرِ عام پر آنے والا ہے۔

نئی نسل کے اہم ترین نقادوں مثلاً حقانی القاسمی، پروفیسر ابنِ کنول، ڈاکٹر مولا بخش اور ڈاکٹر کوثر مظہری وغیرہ نے ان کی شاعری پر طویل مضامین لکھے ہیں اور اب جلد ہی ان کی شخصیت اور شاعری پر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتاب ''نئی غزل کا اینگری ینگ مین'' منظرِ عام پر آنے والی ہے۔

ماہنامہ شاعر ممبئی نے ان کی شعری خدمات پر مختصر گوشہ، سہ ماہی انتساب سرونج نے طویل گوشہ اور پھر سہ ماہی تحریک ادب وارانسی نے طویل گوشہ شایع کیا۔ اور اب ادبی محاذ کو موصوف کا گوشہ شائع کرنے کا فخر حاصل ہو رہا ہے۔ موجودہ شعری منظر نامہ میں ڈاکٹر فریاد آزر کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ عوام و خواص میں یکساں مقبول ہیں۔

ڈاکٹر فریاد آزر برسوں ماہنامہ انٹرنیشنل اردو میڈیا، دہلی اور ماہنامہ عاکف کی محفل، دہلی کے مدیرِ اعزازی رہے۔ اب انٹرنیٹ پر اردو کی خدمت بڑے ذوق و شوق سے کر رہے ہیں۔ ''ادب ڈاٹ کوم'' جو کہ انٹرنیٹ پر گوگل کا اردو کا سب سے بڑا ادبی گروپ ہے، اس کے موڈریٹر ہیں۔ عالمی پیمانہ پر کم و بیش اس گروپ کے ساڑھے چھ ہزار ممبر ہیں۔ فریاد آزر کی ان خدمات سے متاثر ہو کر وائس آف امریکہ سے ان کا طویل انٹرویو دو قسطوں میں گزشتہ مئی 2014 میں چار اور گیارہ تاریخ کی رات ساڑھے دس سے گیارہ بجے تک نشر کیا گیا۔

انھیں سابق صدرِ جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے نشانِ غزل اعزاز سے نوازا تھا۔

فریاد آزر کا ایک شعر جو نہایت سنجیدہ ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا ملاحظہ فرمائیں:

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا ۔ رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

ان کا دوسرا شعر جو عوامی طور پر نہایت مقبول ہوا اسے بھی دیکھیں:

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں ۔ خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

گھر آنگن:

والدین۔ الحاج سید عبدالحق قادری (مرحوم)   والدہ۔ الحاج سیدہ فاطمہ بیگم (مرحوم)   شریکِ حیات۔ محترمہ افروز بانو

اولاد۔ فرحین فاطمہ (بی ایڈ کی طالبہ)   اور   ماریہ فاطمہ (بی۔ اے فائنل کی طالبہ)

رابطہ:۔ ڈاکٹر فریاد آزر۔ E-12/60A حوض رانی۔ مالویہ نگر۔ نئی دہلی۔ 110017

حقانی القاسمی
D-64,FlatNo-10,4th FLOOR
AbulFazalEnclave.JamiaNagar.Okhla
New Delhi-110025

فریاد آزر: تخلیقی اڑان کے نئے زاویے

تخلیق کی Virgin Territory کی سیاحت، عصر حاضر کے بہت ہی کم فنکاروں کا مقدر بنی ہے، غیر مسوس منطقے کی سیر کے لئے جس آشفتگی، دیوانگی، جرأت، بے خطری اور عصری آگہی کی ضرورت پڑتی ہے، اس سے بہت سے تخلیق کار محروم ہیں۔فریاد آزر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ تخلیق کو نیا سیاق وسباق، نیا مفہوم اور نیا تناظر عطا کرنے کی جدو جہد میں اس فکری اور اظہاری منطقہ تک رسائی میں کامیاب ہوئے ہیں جو بہت حد تک کنوارا اور قدرے غیر مستعمل ہے۔ان کی تخلیق میں وہ مرکزی نقطہ اور محوری نکتہ بھی موجود ہے جو عصر حاضر کی بیشتر تخلیق سے غائب ہو گیا ہے۔

آزر کا تعلق تخلیق کے اس تلازماتی نظام اور تناظر سے ہے جس سے تخلیق میں تازگی، تحیر اور تابندگی آتی ہے۔انہوں نے 'تخلیقی اجتہاد' سے کام لیا ہے اور تقلیدِ جامد سے گریز کیا ہے اور ایک نئی تخلیقی سمت کی تلاش نے ان کی شاعری کو اس بھیڑ سے بھی بچا لیا ہے جس میں اکثر فن پارے اپنے نام و پتہ کی تلاش میں مدتوں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔ولی دکنی نے بہت پہلے کہا تھا'' تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن...........فریاد آزر کی شاعری میں بابِ سخن کے نئے نئے در کھلے جاتے ہیں اور ہمیں تحیرات سے ہم کنار کرتے ہیں۔خوشی ہوتی ہے کہ صنعتی ومشینی عہد میں آزر کے اندر کا احساس اور اضطراب زندہ ہے اور اس کی لہریں ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہیں۔فریاد آزر کی شاعری میں جو احساس واظہار ہے، وہ' آج' سے عبارت ہے جس میں' گزشتہ' مکمل طور پر نہ شریک ہے اور نہ ہی مکمل طور پر متروک کہ ان کا حال ماضی سے مستعار نہیں مگر مستنیر ضرور ہے۔آزر کا تخلیقی احساس منفرد اور مختلف ہے۔زندگی کے تعلق سے ان کا Dynamic Approach کہے۔آج کی زندگی کی صورت حال اور انسانی متعلقات کے حوالے سے ان کا زاویہ نظر جداگانہ ہے۔ان کے یہاں اس انسان کی جستجو ملتی ہے جو' گلوبل گاؤں' میں اپنی شناخت کھو چکا ہے اور بے چہرگی جس کی پہچان ہے۔بنیادی انسانی اقدار سے منحرف اور ٹکڑوں میں بٹے ہوئے انسانی وجود کے ذہنی وفکری بحران اور انتشار واختلال کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ان کی شاعری کے ذریعہ انسان کی داخلی' خارجی صورتحال سے آگہی ہوتی ہے۔Globlised Society اور ملٹی کلچر ایج میں سماجی، سیاسی اقدار میں تبدیلیاں آئی ہیں اور انسانوں کے ذہنی زاویے بھی بدلے ہیں۔ایسی بدلتی ہوئی صورتحال میں ان کی تخلیق نہ صرف آج کے مسائل پر نگاہ ڈالتی ہے بلکہ آج کے معاشی' اقتصادی' سماجی' تہذیبی نظام سے بھی بے خوف مکالمہ کرتی ہے۔

جدید غزل کے منظر نامے پر فریاد آزر کا نام اس اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ روایتی حصار سے باہر نکل کر عصری حالات' تغیرات اور تموجات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔اور آج کے عہد کی تفہیم بالکل نئے زاویے سے کی ہے اور اس انسانی ضمیر اور روح کی بازیافت بھی کی ہے جو تینوں زمانوں پر محیط ہے۔

فریاد آزر کی تخلیقی اڑان کے زاویے الگ ہیں انہوں نے احساس و اظہار کے جو صنم کدے تعمیر کیے ہیں' اس میں ان کے خونِ جگر کی نمود ہے۔وہ اپنی ذات میں گم نہیں ہیں بلکہ گردو پیش پہ ان کی گہری نظر ہے:

اس کے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ زندگی آخرت کا عکس ہے
اب ہمیں سوچنا ہے کہ ہم لوگ دوزخ میں ہیں یا کہ جنت میں ہیں

خونِ مشرق کا بہاتے ہی رہیں گے ناحق۔اور کر سکتے ہیں کیا مغربی آقاؤں کے لوگ
ورنہ ہم سانس بھی لینے کو ترس جائیں گے۔سطحِ'اوزون' کو فضلات سے آزادی دے
دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہدِ قدیم۔رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید
ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں۔خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے
یہ اور بات کہ سب جنگلوں میں رہتے تھے۔مگر فضاؤں میں آلودگی بہت کم تھی

یہ ان کے تخلیقی ذہن کی ارتعاشی لہریں ہیں۔سیاست' سماج اور دیگر مختلف سطحوں پر ان کے ذہنی تحرک کے ثبوت کے لئے یہ اشعار کافی ہیں۔ان کی نگاہ کسی خاص نقطہ پر محدود نہیں ہے بلکہ ان کی شاعری ایک طرح سے' جام جہاں نما' ہے جس میں پوری انسانی کائنات کا عکس نظر آتا ہے۔وہ اکثر شعروں میں حیرتوں کی نئی قندیل جلاتے ہیں' ان کی شاعری کی مجموعی قرأت سے پتہ چلتا ہے ان کے یہاں تخلیق کی علمی' عرفانی' وجدانی سطح بہت بلند ہے اور سماجی' سیاسی' سائنسی شعور بالیدہ۔

فکریات کی سطح پر جہاں انہوں نے بہت سے نئے تجربے کیے ہیں یا پرانے تجربوں کی' تقلیب' کی ہے' وہیں لفظیات کی سطح پر بھی وہ ایک نئے آب و رنگ میں نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں لسانی جبر کا وجود نہیں ہے۔ہر وہ لفظ جوان

(بقیہ صفحہ 16 پر)

پروفیسر ابنِ کنول

صدر شعبہء اردو، دہلی یونی ورسیٹی

منفرد لب ولہجہ کا شاعر: فریاد آزرؔ

جس طرح اردو افسانوی ادب میں ۱۹۷۰ کے بعد ایک خاص تبدیلی آئی یعنی آٹھویں دہائی کے افسانہ نگاروں نے ایک نئی راہ اختیار کرتے ہوئے خود کو ترقی پسند تحریک اور جدید رجحان سے الگ کر کے اپنی شناخت قایم کی اسی طرح اس دور کے نوجوان شعرا نے بھی اپنی علاحدہ پہچان بنانے کی کوشش کی۔ فریاد آزر ان ہی نوجوانوں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے تقریباً آٹھویں دہائی میں اپنی شاعری کی ابتدا کی اور بہت جلد اپنے منفرد موضوعات کی وجہ سے دہلی کے ادبی حلقوں میں مشہور ہو گئے۔ انہیں بے باک شخص، شاعر و نقاد پروفیسر عنوان چشتی کی ادبی سرپرستی بھی حاصل رہی جس کی وجہ سے ان کے لہجہ میں بے باکی پیدا ہوگئی۔ میں فریاد آزر کو ذاتی طور پر تین دہائیوں سے جانتا ہوں، ان کے یہاں ٹھہراؤ نہیں ہے، خوب سے خوب تر کی جستجو مسلسل جاری رہتی ہے، کچھ کر گزرنے کا حوصلہ ہمیشہ رہتا ہے:

بے بسی سے مری بے حس نہ سمجھ لینا مجھے
دل میں وہ لاوا ابلتا ہے کہ رب جانتا ہے

فریاد آزر کے اندر جذبات و احساسات کے ابلتے لاوے نے ان کی شاعری میں ایسی تپش پیدا کر دی ہے جو مردہ احساسات کو گرماتی ہے، ان کے اشعار انسان کے اس کرب کی عکاسی کرتے ہیں جن سے آج کا انسان جوجھ رہا ہے:

فضائے آتشِ گجرات سے جو بچ نکلے۔ پرندے پھر نہ گئے لوٹ کر جہنم میں
پھر بیعتِ یزید سے منکر ہوئے حسین۔ اور ظالموں کی فوج ستم ڈھا رہی ہے پھر
زہر پینا ہی پڑے گا ہمیں اپنا اپنا۔ اب کوئی دوسرا شنکر نہیں آنے والا
وہ امن و آشتی کا نام لے کر۔ جہاں میں اپنا ڈر پھیلا رہا ہے

فریاد آزر جس دور سے گزر رہے ہیں یا گزر چکے ہیں وہ تاریخ کا ایسا دور ہے جس مین بظاہر انسان ترقی کی منازل طے کرتا ہوا چاند پر پہنچ گیا ہے لیکن بباطن آج اکیسویں صدی میں آ کر بھی وحشیانہ زندگی جی رہا ہے۔ عراق، افغانستان، فلسطین، بوسنیا، چچنیا، لیبیا، شام اور مصر جیسے ممالک میں مظلوموں کی آہوں اور ظالموں کی بم باری نے تخلیقی فن کار کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس جھنجھلاہٹ کا اظہار فریاد آزر کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے:

سروں کی فصل کٹتے دیکھنا اس کی سیاست ہے
ہے اس کا مشغلہ صحنِ چمن میں زہر بونے کا
کربلا ہو کہ فلسطین کہ ہو بوسنیا۔ درد صدیوں سے مرا نام و نسب جانتا ہے
یم بہ یم، صحرا بہ صحرا نقشِ جاں جلتا ہوا۔ آتشِ نمرود میں سارا جہاں جلتا ہوا
پرندے لوہے کے، کنکر بموں کے پھینکتے ہیں
عذاب ہم پہ ہے کیوں ابرہا کے لہجے میں

فریاد آزر کا بسیرا اس شہر میں ہے جہاں پورے ہندستان بلکہ عالم کی تصویر دکھائی دیتی ہے، اس لئے ان کے مشاہدات میں وسعت ہے، تجربات میں گہرائی ہے۔ وہ اپنے مشاہدات، مطالعات اور تجربات کی کی روشنی میں احساسات کو شعوری پیکر عطا کرتے ہیں۔ فریاد آزر کے موضوعات محدود نہیں ہیں، وہ ہر موضوع کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ موضوعات کی پیش کش میں ان کے میر اور ناصر کاظمی کی سی سادگی ہے۔ وہ بڑی فن کاری سے تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کو اپنی غزل کا حصہ بنا لیتے ہیں:

اس قدر سبز درختوں کو نہ کاٹو کہ کہیں۔ سانس لینے کو ترس جایے ہوا بے چاری
ہزاروں ابر بہ لشکر سجا رہے ہیں تو کیا۔ ہوائے سبز ابابیل ہونے والی ہے
ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں
خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

فریاد آزر کے یہاں ہندو تہذیب کا عکس بھی ملتا ہے اور اسلامی تاریخ کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ان کے وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کو ظاہر کرتی ہے۔ ان کی غزل غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے، وہ کہیں فریادی نظر آتے ہیں اور اپنے عہد کا دکھ بیان کرتے ہیں، کہیں آزر بن کر اپنے محبوب کا بت تراشتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ فریاد آزر کی شاعری اردو شاعری کی تاریخ میں خود اپنا مقام متعین کرے گی اس لیے کہ انکا لب ولہجہ، موضوعات اور ان کی پیش کش اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں سے منفرد ہے۔

☆☆☆

چلو روحانیت کی سمت لوٹیں   بدن سب جاذبیت کھو چکا ہے

ڈاکٹر کوثر مظہری
شعبہء اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

فریاد آزرؔ کی تخلیقی آزری

اردو غزل میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اس کے واضح نقوش بہت کم شاعروں کے یہاں نظر آتے ہیں۔ اپنے عہد کی ستم ظریفیوں اور عیاریوں کو آئینہ دکھانے کی ہمت ہر شاعر میں نہیں ہوتی۔ اس کام کے لئے صفائے باطن اور شعورِ فن کے ساتھ ساتھ تخلیقی قوت چاہیے۔ فریاد آزر ایک ایسے شاعر ہیں جو ۱۹۸۰ کے بعد کی ادبی نسل میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں فرد کی بے ضمیری اور معاشرے کی بے مروتی دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

پھر میں سچ بولنے والا ہوں یزیدوں کے خلاف۔ پھر مرے سر پہ وہ شمشیر نظر آنے لگی

اب تو ہر شہر ہے اک شہرِ طلسمی کہ جہاں۔ جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے

میں اپنی لاش کو تنہا ہی دفن کر لوں گا۔ کہ تم بھی جاؤ، سبھی لوگ گھر گئے اپنے

فریاد آزرؔ نے رشتوں کے ٹوٹنے اور آدمی کے بکھر جانے کو بھی اپنے شعروں میں پیش کیا شعر ملاحظہ کیجئے:

نہ کوئی دوست نہ ساتھی نہ کوئی رشتہ دار۔ غریب کیا ہوئے سب لوگ مر گئے اپنے

بسا رہا ہے ہر اک فرد اک الگ ہی جہاں۔ بکھر رہا ہے ہر اک خاندان قسطوں میں

فریاد آزر نے غزل کے چہرے سے پردۂ الہام کو چاک کیا ہے۔ وہ صاف گوئی سے کام لیتے ہیں اور معاشرے میں جو تبدیلی رونما ہو رہی ہے یا ہو چکی ہے اسکی نشاندہی کرتے ہیں وہ جدید ذہنوں اور جدید تہذیبی بساط پر کھڑی نئی نسل کو طنز کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ آزر کے فکری ابعاد کی زد میں عہدِ جدید اور عہدِ قدیم دونوں ہیں۔ یہاں ایک ہی غزل کے دو شعر دیکھئے:

دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہدِ قدیم۔ رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید

سب سنائی دیتا ہے آزرؔ اذانوں کے سوا۔ محوِ حیرت ہیں کہ ہم بھی ہو گئے کتنے جدید

تہذیبی سفاکیت کو آئینہ دکھانے کا کام نئی غزل میں خوب کیا گیا ہے لیکن فریاد آزر کے یہاں یہ رنگ قدرے تیز ہے۔ موضوع اور موقف پر غور کیجئے اور اوپر ذکر کئے گئے انسانی بے بسی کے حوالے سے چند شعر دیکھئے:

عجیب طور کی مجھ کو سزا سنائی گئی۔ بدن کے نیزے پہ سر رکھ دیا گیا میرا

پانوں کے نیچے سلگتی ریت، صدیوں کا سفر۔ اور سر پر بارِ سقفِ آسماں جلتا ہوا

آتا تھا دیر رات کو جاتا علی الصباح۔ بچے اسے سمجھتے تھے دفتر کا آدمی

انسان کبھی کبھی غفلت شعاری میں اپنی عمر کے قیمتی لمحات گنوا دیتا ہے۔ اسے پتہ نہیں ہوتا کہ مستقبل کی کامیابی کا راز حال کی محنت اور مشقت میں ہے۔ فریاد آزرؔ نے بڑی خوبصورتی سے اس مضمون کو پیش کیا ہے۔

ہم نے گزار دی جسے چھاؤں میں بیٹھ کر۔ وہ زندگی تھی دھوپ سے لڑنے کی زندگی

اسی طرح کبھی انسانی پس و پیش اور کشمکش کے موضوع کو آزرؔ پیش کرتے ہیں، کبھی کبھی انسان کے لئے ایک لمحہ بھی بھاری پڑتا ہے اور کبھی ذرا سی غفلت سے انسان بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ شعورِ ذات کی کلید احساسِ لطیف ہے۔ دونوں کی ہم آہنگی سے ہی فکری بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ آزرؔ اس راز سے واقف ہیں۔ زمانے کی ستم ظریفی اور گردشِ ایام پر ان کی گہری نظر ہے۔ جس کے اندر ذرا بھی جھجھک ہے (بلکہ اس جھجھک کو میں تہذیبی رکھ رکھاؤ کہوں گا) وہ زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ فریاد آزر نے اسی بات کو تخلیقیت کے عناصر میں گھلا ملا کر یوں پیش کیا ہے:

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا
رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

وہ بے دریغ کئے جا رہا تھا قتل مرا۔ میں منتظر تھا کہ اس پر عذاب اترے گا

فساد بہت ہی سامنے کا موضوع ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی شاعر ہو گا جس نے فساد کے حوالے سے ایک آدھ شعر نہ کہے ہوں۔ اس کو آزرؔ یوں پیش کرتے ہیں۔

جہاں فساد میں اعضائے جسم کٹ کے گرے
اسی زمین سے ہم لخت لخت اگنے لگے

فریاد آزرؔ اس دور کے شاعر ہیں لہٰذا اس عہد کے کرب کو انھوں نے سمجھا ہے، محسوس کیا ہے معاملہ چاہے ذاتی ہو، سماجی ہو یا بین اقوامی، انکی نگاہ ہر اہم موضوع پر ضرور پڑتی ہے۔ چاہے معاملہ سائنسی ترقیات اور خلائی سیارچوں کا ہو جس کے ذریعہ آج نہیں تو کل اسٹار وار ہونا ہی ہونا ہے، یا پھر زمینی، فضائی یا خلائی آلودگی کا ہو یا بین اقوامی دہشت گردی اور اس کو بہانہ بنا کر پوری دنیا میں ایک مخصوص مذہب کے ماننے والوں کی جگہ جگہ نسل کشی ہو، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اس کو بغور دیکھ رہا ہے اور اس پر آنسو بہا رہا ہے۔ ایسے اشعار کی تعداد بہت ہے بخوفِ طوالت محض چند اشعار پیش ہیں۔

خلاؤں میں بھی شر پھیلا رہا ہے۔ پرندہ کتنا پر پھیلا رہا ہے

فضائے شہر آلودہ بنا کر۔ وہ گاؤں پر نظر پھیلا رہا ہے

کون جائے ذوقؔ اب دلّی کی گلیاں چھوڑ کر
صبح کی تازہ ہوا لے آئیں گے دوکان سے

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں۔ خوب صورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے
فضا کتنی بھی آلودہ ہو آزرؔ۔ ہمارے ذہنوں سے بہتر ہے اب بھی
اس قبیلے کے لہو میں ذائقہ اتنا لگا۔ جس کو بھی دیکھا اسی کے خون کا پیاسا لگا

اس قدر آنکھیں کھلی رکھنے والا افسانہ [illegible] بہت بڑی بات ہے:

کرسکتا ہے ورنہ ذاتی مشغلہ کی بنیاد پر اشعار کہنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہر دور میں موجود رہتی ہ مگر وقت انھیں بھلا دیتا ہے۔ فریاد آزرؔ ایسے شاعر ہیں جنھیں نہ تو غزل کی تاریخ فراموش کرسکتی نہ ہی وقت کا غبار ان کے افکار کو دھندلا کرسکتا ہے۔ بہر حال غزل گوئی میں فریاد آزرؔ کی ریاضت جاری ہے۔ مجھے امید ہے کہ نئی غزلیہ شاعری کے متون میں ان کی زبردست حصہ داری رہے گی۔

☆☆☆

(فریاد آزر: تخلیقی اڑان کے نیے زاویئے کا بقیہ)

کے احساس کی ترسیل کردے خواہ اس کا تعلق کسی زبان، مذہب، ملک سے ہو اس کا استعمال سے حذر نہیں کرتے، یہی لسانی اور فکری جمہوریت فریاد آزر کا فکری شناس نامہ ہے۔ ان کی شاعری میں وہ جمہوری آوازیں ہیں جو جلجا میش، سقراط، سرمدؔ اور منصور کے 'حلق بریدہ' سے بلند ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے سیاسی، سماجی، سفاکیت، آمریت، مطلق العنانیت کے خلاف اپنی شاعری کو بطور ہتھیار استعمال کیا ہے اور عالمی استعماری نظام کے خلاف آواز بھی بلند کی ہے۔ فرقہ واریت، فسطائیت کے خلاف بھی انہوں نے اپنی تخلیقی توانائی کا استعمال کیا ہے:

بھر رہا تھا زہر وہ معصوم ذہنوں میں مگر۔ ہم پہ نفرت گھولنے کا جرم عائد ہو گیا
ہندو کوئی تو کوئی مسلمان بن گیا۔ انسانیت بھی مذہبی خانہ میں بٹ گئی
بچوں پہ ایسا جادو چلا ہے نصاب کا۔ اکبر کا نام لینے لگے غزنوی کے ساتھ
کہیں بھی قتل ہو کیسی عجیب سازش ہے۔ لہو میں ڈوبی ہوئی مری آستین لگے

ان کی تخلیق کا توانائی نظام انتہائی متحرک اور فعال ہے۔ ان کے یہاں بصیرت اور آگہی کی وہ بلند سطح ہے جو ماضی اور مستقبل پر نگاہ رکھتی ہے۔ ان کا آئینہ ادراک روشن ہے جس میں وہ ماضی کے ساتھ مستقبل کی آہٹوں کو بھی محسوس کرتے ہیں۔

فریاد آزر کی شاعری میں عصر حاضر کے مسائل کا اظہار و ادراک ہے اور یہی عصری حسیت اور آگہی ان کی شاعری کو نقطہ انفرادیت عطا کرتی ہے۔ اس میں ایک آفاقی شعور بھی ہے، ژرف نگاہی اور باطنی روشنی (Inner Light) بھی جو آج کی تخلیق میں کم نظر آتی ہے۔ معاشرہ کی تمام متضاد اور متخالف لہروں کو انہوں نے اپنی شاعری میں سمو لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں ایسے نقوش مرتسم کردیے ہیں جو سماج اور سیاست کی راہوں میں بھٹکنے والوں کو بھی صحیح سمت کا اشارہ دیں گے اور انہیں منزل مراد تک پہنچا دیں گے۔

فریاد آزر کا تہذیبی، سماجی، سیاسی، شعور پختہ ہے اور شعور کی مختلف سطحیں ان کے تخلیقی نظام سے مربوط اور منسلک ہیں۔ اسکائی اسکر یپر کلچر کے اس عہد میں چھوٹی چھوٹی زمینی حقیقتوں اور ارضی صداقتوں کو فنکارانہ انداز میں پیش کرنا بہت بڑی بات ہے:

دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہدِ قدیم۔ رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید
مجھے اب اور سیاروں پہ لے چل۔ میں گلوبل گانو سے اکتا گیا ہوں
ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں۔ خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے
اس قبیلے کے لہو میں ذائقہ اتنا لگا۔ جس کو بھی دیکھا اسی کے خون کا پیاسا لگا
اب تو ہر شہر ہے اک شہرِ طلسمی کہ جہاں۔ جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے
سب حقائق مجھ سے بھی پہلے کہیں موجود تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کچھ مری ایجاد ہے

تخلیق کی سطح پر ایقاظ اور بیداری کا جو فریضہ فریاد آزر انجام دے رہے ہیں، آج کی بے حسی کے دور میں بہت سے فنکار اپنی ذمہ داری کے احساس تک سے محروم ہیں۔ انہیں 'احساسِ زیاں' ہی نہیں تو پھر معاشرتی، سماجی، اقدار کے تحفظ کا خیال کہاں سے آئے گا۔ فریاد آزر تخلیق کے منصب سے باخبر ہیں اور اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ۔ اس لئے وہ اپنی تخلیق کے ذریعہ ہر سطح پر ابنِ آدم کو کائنات کے مسائل اور اس کی پیچیدگیوں سے آگاہ کر رہے ہیں۔ ان کی پوری شاعری مقصدیت سے معمور ہے وہ گل و بلبل کی داستاں، یا فسانہء شب ہائے دراز، پر یقین نہیں رکھتے بلکہ آج کی سفاک جاں گسل حقیقتوں کو اپنی شاعری کا موضوع اور تخلیق کا مرکزی نقطہ قرار دیتے ہیں اور اسی محور پر ان کی شاعری حیات و کائنات کے مختلف مسائل اور موضوعات کا طواف کرتی رہتی ہے۔ طوافِ کوچہء جاناں، کے بجائے 'غم دوراں' سے ہی آج کی شاعری معتبر اور منفرد قرار پاتی ہے۔

فریاد آزر کی شاعری میں یہی "غم دوراں" عذاب جاں، آشوب عصر اپنی تمام تر تخلیقی منطق، معروضیت اور فنی، فکری ہنر مندی کے ساتھ موجود ہے۔ ☆☆☆

زمیں پہ آمدِ جبرئیلؑ ختم ہوبھی چکی　　ندا ہے صورِ سرافیل ہونے والی ہے

عمران عظیم

فریاد آزر: شگفتہ خیال شاعر

بنارس کی سرزمین جہاں صنعت وحرفت اور سیاحت کے سبب عالم گیر شہرت کی حامل ہے، وہاں اس کی ثقافتی، تہذیبی نیز ادبی سرگرمیوں کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔اس سرزمین پر بین الاقوامی اہمیت کی حامل شخصیات نے جنم لیا اوراپنے اپنے کمالات وجوہر کالوہا بھی منوایا۔موسیقی اور رقص جیسے فنون لطیفہ کے ضمن میں بسم اللہ خاں، گرجادیوی، پنڈت کشن مہاراج، ستارہ دیوی اور ایم راجن کا تعلق بھی اسی شہر سے رہا ہے۔ ہندو مذہب کے علم برداروں نے ویدانت، فلسفہ اور بھکتی کا گیان بھی یہیں پر حاصل کیا۔کبیر داس، پریم چند، غالب،فراق اورقرۃ العین حیدر نے بھی اس سرزمین سے کسی نہ کسی صورت سے تعلق رکھا۔نامور ڈراما نگار آغاحشر بھی بنارس میں آکر بس گئے تھے۔عہد حاضر میں یہاں کے بہت سے مخلص خدام شعروادب سرگرم عمل ہیں اوراعلیٰ تخلیق ادب میں مصروف ہیں۔

دبستان بنارس کے بالغ اور بیدار مغز شاعرفریاد آزر دہلی میں مقیم ہیں تازہ فکراورتازہ کارغزل گوہیں۔ان کی شاعری کئی دہائیوں پرمحیط ہےاوران کا ادبی سفرنہایت خلوص ولگن کے ساتھ جاری ہے۔وہ اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے شاعرہیں۔انہوں نے عہد حاضر میں وقار کی شکست وریخت،تہذیب و اخلاق کے عروج و زوال، زندگی کی افراتفری، نے ہمواریوں اور نامساعد حالات کو دیکھا ہے اس لیے ان کی شاعری میں معاشرتی، تہذیبی وتمدنی موضوعات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ شعری بصیرت کے ساتھ سماجی و سیاسی مسائل ونکات کا بھی بھرپور شعور رکھتے ہیں جس کا اظہاران کی شعری کائنات میں بکثرت مل جاتا ہے۔

فریاد آزر کی شاعری میں جدت، ندرت، اختراع اور اچھوتا پن نمایاں ہےغزل اس تہذیب کا نام ہےجس کی دلکشی اس کی رمزیت واشاریت میں مضمر ہے۔ یہ عناصر تاریخی تلمیحات کے ساتھ ان کی شاعری کے سرور وتلذذ میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔مثال کے طور پران کے اس نوع کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پھر بیعتِ یزید سے منکر ہوئے حسینؑ۔اورظالموں کی فوج ستم ڈھارہی ہے پھر
وہ لمحہ سرورِعالم کوجب ملی معراج۔اسی کے صدقے میں جاں سے سنبھل گئیں صدیاں

تشنگی ایسے لبوں کی کیا بجھا پاتا فرات۔مدتوں سے خودتھا جن کی دید کا پیاسا فرات

دفن کردیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہدِقدیم۔رحم ہی میں ماردیتا ہے اسے دورِجدید
گرویا کی یاد انگوٹھے سے آنے لگتی ہے۔میں جب بھی ہاتھ میں تیروکمان لیتا ہوں

عہد حاضر مادیت کا دور ہے۔ ہر شخص معاشی نقطۂ نگاہ سے سوچتا ہے۔ بے اطمینانی ہر شخص کا مقدر ہے۔غیر محفوظیت ،قنوطیت اور مایوسی کے ماحول میں انسان اپنی زندگی قسطوں میں بسر کرنے پر مجبور ہے۔ان موضوعات کا اظہار آزر کے اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے:

کیوں نہیں یکبارگی کی موت مرتی زندگی
اے مری جانکاہ قسطوں میں گزرتی زندگی

ہم ایک ساتھ نہیں کرتے گھر کی آرائش۔ہم ایسے لوگ بڑھاتے ہیں شان قسطوں میں
پہلے تو سر سے سایہ اٹھا آسمان کا۔پھرپاؤں کے تلے سے زمیں بھی کھسک گئی
ضد کرتا نہیں سستے کھلونوں کے لیے بھی۔یہ بچہ مرا مجھ سے بھی بوڑھا نظر آیا
چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں میں۔رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں
ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں۔خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہوگئے

شکست وریخت کے نوحوں کے علاوہ ان کی شاعری میں زندگی دردمندی کا احساس بھی ہے۔فرید آزر جس زمانی اور مکانی حدود میں رہتے ہیں ان میں درپیش مسائل کواپنی شاعری میں بڑی مہارت اورسلیقہ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ان کے شاعری اپنے قاری کوانوکھے کیف وسرور سے سرشار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔وہ کسی ایک نہج پر گفتگونہیں کرتے بلکہ اپنے شعری اظہار سے وہ انسانی زندگی سے وابستہ مختلف موضوعات پر بات کرنے کا ہنر رکھتے ہیں۔موضوعات کا تنوع ان کے نظام فکر کی عکاسی کرتا ہے۔انہوں نے اپنے جذباتی وذہنی تجربات کی نقش گری میں مکمل حسیت کے ساتھ صنف غزل کے فنی التزام اورڈسپلن کوبھی ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا،تاہم وہ محنتی شاعرہیں۔انہوں نے اپنی ذہانت اور صلاحیت کی بنیاد پرکئی غیر مانوس اوراجنبی قوافی کا بھی استعمال تجربے کے نام پرکیا ہے میری رائے میں اسے شعری وسعت میں نیک شگون اس لیے نہیں کہا جاسکتا ہے۔غزل کے مطلع کے ساتھ ہم صوت قوافی والے اشعار

(بقیہ صفحہ 25 پر)

پروفیسر مولا بخش
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سبز آدمی کی تلاش اور آزرؔ کا جہانِ غزل

تجھ سے بچھڑے تو آغوشِ مادر میں، پھر گود میں، پھر سفر در سفر
دیکھ پھر تجھ سے ملنے کی خواہش میں کب سے لگاتار ہجرت میں ہیں
منے کیوں آ گیا۔ کربلا، خوں ریزی، کوفہ، تشنگی، صحرا، فرات
جہاں فساد میں اعضائے جسم کٹ کے گرے۔ اسی زمیں سے ہم
لخت لخت اگنے لگے
یہاں فرار کی راہیں تو ہیں مگر مسدود۔ کہاں کو جائے کوئی کائنات سے بچ کر

مذکورہ بالا اشعار فریاد آزر کے شعری مجموعے 'خزاں میرا موسم' اور 'قسطوں میں گزرتی زندگی سے' ماخوذ ہیں جو آج دنیا میں ہر سو پھیلی ایک قوم مسلمان کی ازل سے اب تک کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی تشخص کی کہانی کہہ رہے ہیں۔ کربلا کی خوں ریزی، شہر کوفہ کی مکاری اور ان پر کڑی نگاہوں کے پہرے انہیں اکثر فرات اور اپنے پیاس کی شدت سے یاد دلاتے رہتے ہیں۔ آزادی کے بعد کے شعرا اور بالخصوص ۸۰ کے بعد کے اردو شعرا کے یہاں اقلیتی مخاطبے کا فوراً اسی پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد پاکستان ہجرت کر جانے سے انکاری مسلمانوں کو یہاں کے ایک طبقہ نے اسی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا، جس نگاہ سے وہ پاکستانی مسلمانوں کو دیکھا کرتا ہے۔ لہٰذا یہاں کے مسلمانوں کو خود کے اقلیت میں ہونے کا احساس شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی نیز اقتصادی میدان میں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر اقلیتی طبقے میں بھی احساس کمتری پیدا ہو گئی اور اس طبقے کے فکشن اور شاعری حتیٰ کہ غزل میں بھی اقلیت و اکثریت جیسے جوڑے دار ضدین میں تبدیل ہو گئے۔ ادب کی ایک بڑی تحریک ترقی پسندی اور مارکسی آئیڈیولوجی کی ہزار دہائیاں دینے کے بعد بھی ہندوستان میں غیر مذہبی ذات پات سے عاری لبرل معاشرہ قائم نہ ہو سکا اور تیزی سے ہندوستانی سیاست نے علیحدگی پسندی، ذات پات کی سیاست اور مذہبی جنون کو فروغ دیا۔ سیاست کے لیے اس ملک کی بڑی اقلیت مسلمان ووٹ بینک سے زیادہ کچھ ثابت نہ ہو سکے اور بدلتے وقت کے ساتھ مسلمانوں میں احساس کمتری کے ساتھ احساس محرومی دن دونی رات چوگنی بڑھتی چلی گئی۔ بقول آزر:

کچھ بھی کہہ دیتا ہے وہ گزرے سلوں کے نام پر۔ آج ماضی کا بھی سینہ چاک ہونا چاہیے
مدتوں سے مرا ہوا ہوں میں۔ مجھ کو پھر ایک بار زندہ کر

ایسا لگتا ہے کہ فریاد آزر نے اپنی شاعری کو اقلیت کتھا میں تبدیل کر دیا ہے۔ پہلے شعر میں 'وہ' بتانے کی ضرورت نہیں کہ اکثریتی جبر ہے۔ اقلیت کے اندر پل رہے غم و غصہ اور خوف کی نفسیات اس شعر میں ماضی کا سینہ چاک کرنے جیسے فقرے سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔ ماضی اس شعر میں کسی خاص فرقے کے لیے رقیب کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کی وجہ سے ایک خاص قوم کے پیچھے مصائب کے بھوت پڑ گئے ہیں۔ اس کی وجہ آزر کے نزدیک یہ ہے کہ:

ہمارا حال ماضی کا پتہ دیتا نہیں یکسر × ہماری عظمت رفتہ پہ کس کو اعتبار آئے

جدیدیت کے رجحان کے تحت تنہائی اور ذات کے کرب نیز زندگی کی بے معنویت جیسے منفی قدریں شعر و ادب میں 1960 تا 1975 قارئین کو جس حد تک بھی اپنے درد کا درماں معلوم ہوئی اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ وجودیت کے فلسفے پر گہری نگاہ رکھتے تھے (جیسا کہ مغرب کے قارئین نے اسے اپنے مسائل کی رو سے اسے اپنے ذہن کا حصہ بنایا تھا) اس نوع کے ادب سے ان کی تھوڑی سی دلچسپی ہندوستانی سیاست کے زیر اثر (اس طبقے میں جو اردو جانتا تھا) ان میں سیاسی طور پر یتیم قوم ہونے کے شدید احساس نے پیدا کی تھی۔ گویا جدیدیت اقلیتی احساس کمتری جیسے مرض کا علاج نہیں تھی بلکہ یہ فقط ان کے زخموں کو سہلانے کا کام کر رہی تھی۔ بعد کے ادوار میں یعنی ۸۰ کے بعد اردو شعر و ادب میں ہندوستانی سیاست کی پیدا کردہ اقلیتی و اکثریتی مخاطبے کے اظہار نے شعر و ادب میں مرکزیت حاصل کر لی۔ ذات پات کی سیاست، علیحدگی پسندی کی تحریکوں کے شور، عام آدمی کی بے روزگاری، اپنے عقیدے اور اپنی ثقافت کے تحفظ کے جذبے کا فروغ اور ان جیسے اور بھی مسائل جیسے ماحولیاتی آلودگی، زبان کی سیاست وغیرہ جیسے مسائل ۸۰ کے بعد کے شعر و ادب کی فکر مندی قرار پایے۔ اردو غزل نے بھی اپنی شعریات کی شرطوں پر نئے مضامین اور سابقہ جملہ غزلیہ اسالیب کو اپناتے ہوئے غزل کی زبان کو حتی الامکان اپنے عہد کے روزمرہ کے قریب کیا۔ اس عہد کی غزل کے اختصاص کو متعین کرنے میں کچھ جدیدیت کے شعرا کے ساتھ ساتھ جن شعرا نے اس دور کے بعد مابعد جدید غزل کی منفرد آواز کو وقار بخشا ان میں فرحت احساس، منظور ہاشمی، اسعد بدایونی، عنبر بہرائچی، منور رانا، انیس انصاری، اظہر عنایتی، عبد الاحد ساز، شارق عدیل، مہتاب حیدر نقوی، راشد انور راشد، شین کاف نظام، کرشن کمار طور، سلیم انصاری، شاہد کلیم، پروین کمار اشک، عشرت ظفر، عین تابش، جمال اویسی، خالد محمود، شہپر رسول، عذرا

پروین، طارق نعیم، راشد طراز، ملک زادہ جاوید، شہباز ندیم ضیائی، عالم خورشید، خال عبادی، کوثر مظہری، مشتاق صدف، اقبال اشہر، خورشید اکبر، رئیس الدین رئیس، رسول ساقی، ابراہیم اشک اور بھی کچھ شعرا کے نام لیے جا سکتے ہیں جن میں فریاد آزر نے خود کو منفرد رنگ کی شاعری پیش کرنے میں کسی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

فریاد آزر نے ماقبل شاعر اقبال کے مخاطبے کو ہم عصر سیاق اور اپنی طرح کی زبان میں پیش کیا ہے یعنی اپنے مذہب، قوم اور اپنی ثقافت کی زبوں حالی کا ماتم کرنے کے بجائے اس پر غور کرنے کی طرف قاری کی توجہ مبذول کی ہے۔ لیکن اقبال کے یہاں اقلیتی مخاطبہ نہیں ہے۔ آزر نے اقلیتی مخاطبہ اور مسلمانوں کی پسماندگی اور عالمی سطح پر ان پر اور ان کے خلاف کی جانے والی سیاست پر آنسو بہانے کے بجائے ان میں حوصلہ پیدا کیا ہے اور ان مسائل کا تجزیہ کیا ہے ہاں اقبال وہاں یاد آتے ہیں جہاں جہاں آزر نے مسلمانوں کے شاندار ماضی کی واپسی کی تمنا کی ہے لیکن اس احساس کے ساتھ کہ:

کچھ تو ہوگا حال سے ماضی میں ہجرت کا سبب۔ یوں ہی بس یادوں کی چادر تانتا کوئی نہیں
وہ شخص آج بھی ماضی سے ایسا الجھا ہے۔ کہ اس کے پاؤں ہیں جنت میں، سر جہنم میں

یعنی ماضی سے لگاتار رشتہ بنائے رکھنے کا رجحان آزر اور ان کے معاصرین میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے اور یہیں پر اقبال کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ فریاد آزر نے اپنی شاعری میں کوڈ کے طور پر کربلا اور اس کے متعلقات صحرا وغیرہ کا وافر مقدار میں استعمال کیا ہے اور یہ بھی کہ ماضی کی شاندار روایتوں کو یاد کرنے اور یاد دلانے کا ایک فنی حربہ ثابت ہوا ہے۔ اس کے علاوہ فریاد آزر کی غزلوں میں عشقیہ موڈ اور اس کی تخلیقی و تہذیبی رنگ کی پیش کش کا فنی انداز و اسلوب بھی نظر آتا ہے لیکن فریاد آزر کی شاعری کی سب سے بڑی فکرمندی سبز آدمی کی تلاش ہے جو بیک وقت قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی حکومت، ان کی زندگی، مذہبی اسلوب، انسانیت پسندی کی معراج اور انسانیت نوازی کے اس سنہرے دور کے آدمی کی واپسی کا ساختیہ معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی سبز آدمی کی اس تلاش کے عقب میں وہ سوچ بھی فنی طریقے سے بلند ہوتی ہے جسے ہم سبز انقلاب (Green Revolution) کہتے ہیں۔ آزر کے غزلیہ متن کا ایک بڑا حصہ ماحولیاتی آلودگی سے دنیا کیونکر بربادی کے دہانے پر ہے اس نوع کی فکرمندی اور انتباہ پر مبنی ہے۔

آزر کے اب تک تین شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'خزاں میرا موسم' (1996) دوسرا مجموعہ 'قسطوں میں گزرتی زندگی' (2005) تیسرا مجموعہ 'کچھ دن گلوبل گاؤں میں' (2009) اپنے عنوان سے ہی مقصدی شاعری یا مسائل پر مبنی شاعری کا پتہ دیتا ہے۔ 'خزاں میرا موسم' کا میر افسانہ مسلمان قوم ہے جس پر خزاں یعنی زوال کا عرصہ صدیوں سے طاری ہے۔ مجموعے کا عنوان اسی امر کا کنایہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا مجموعہ ہندوستان ہی کیا پوری دنیا میں تجارت کے لیے قرض، تعلیم کے لیے قرض، گھر خریدنے اور بنانے کے لیے قرض حتیٰ کہ موٹر خریدنے اور ٹی وی اور فریج کے لیے بھی قرض لینے پر مجبور آج کا آدمی اور نئے ساہوکاروں کی چکی میں پستا ہوا عام آدمی کے المناک انجام کا کوڈ معلوم ہوتا ہے۔ تیسرا مجموعہ 'کچھ دن گلوبل گاؤں' میں جو ان کے دو سابقہ مجموعوں کا انتخاب ہے، شاعر کی اپنی ہی شاعری کی قرات کی ایک صورت معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ سیدھے گلوبلائزیشن پر طنز ہے مگر اس ایقان کے ساتھ عام آدمی اس سلوگن سے کچھ ہی دنوں کے لیے متاثر ہوا ہے۔

مجھے اب اور سیاروں پہ لے چل۔ میں گلوبل گاؤں سے اکتا گیا ہوں

ذکر یہ کیا جا رہا تھا کہ ان کی شاعری میں سبز آدمی کی اساطیر کا ایک سیاق بلکہ زیادہ تر سیاق 'مرد مومن' یا اسلام کا پسندیدہ رنگ سبز ہے جو شانتی اور امن کی علامت ہے۔ اگر سبز آدمی سے متعلق مباحث کی اساطیر کا مطالعہ کیا جائے تو یہ منکشف ہوتا ہے کہ وہ آدمی جس کی تصویر پیڑ کے پتوں کی ہیئت میں بنائی گئی ہو۔ اب ذرا اس خیال سے ملتی جلتی ایک صورت آزر کے مندرجہ ذیل شعر میں ملاحظہ فرمائیں:

خزاں نصیبی کا بوڑھا شجر بھی خوش ہے بہت۔ کہ برگ شاخوں پہ کچھ نیک بخت اگنے لگے

شعری کردار ماحول دوست ہے۔ سوکھے درخت کو بوڑھا شجر کہا ہے۔ یہ بوڑھا شجر اپنی ہی شاخوں پہ کچھ پتے اگتے دیکھ کو خوش ہے لیکن برگ کو نیک بخت قرار دینے سے صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ اسی طرح ہمارے معاشرے کے بزرگ جب اپنے نونہالوں میں اچھے گن دیکھتے ہیں تو ان کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ شعر پڑھتے ہی آدمی کی وہ تصویر سامنے آتی ہے جس کی تصویر پیڑ کے پتوں کی ہیئت میں بنائی گئی ہو۔ اشارہ اس جانب ہے کہ فطرت اور انسان دو ہے ہی نہیں۔ راشٹریہ سہارا اخبار کے ایک کالم "مسلمانوں کا عالمی منظرنامہ" میں واشنگٹن کے مسلمانوں کے حوالے سے سہارا گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی نے ایک دلچسپ معلومات فراہم کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "۱۴ سو سال پہلے قرآن کریم میں کائنات کے ہر راز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ماحولیات کی تباہی ایک خطرناک عمل ہے ان نظریات کے تناظر میں زمین کے تحفظ اور اسلام کے درمیان ایک مضبوط رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اس طرح واشنگٹن میں اسلام کے سائنسی نظریات اور انسانیت کی خدمات کے تحت اس کا ایک بلاگ http:/Dc Green Muslims blogspot.com پر دستیاب ہے۔ اسی طرح Dc Green Muslims اس بات کو سمجھتا ہے کہ زمین پر آلودگی کے ان اثرات کا معاملہ اسلام کے لیے کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔" (روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، 30 مئی، 2014، ص: 10 مسلمانوں کا عالمی منظرنامہ، سید فیصل علی)

دراصل اسلام کا علامتی نشان 'سبز' ہے جو امن اور شادابی اور تروتازگی کی طرف اشارے کرتا ہے جس کا ایک سیاق ماحولیات کے تحفظ میں اس سبز رنگ یعنی ہریالی کا تحفظ اور اس کا فروغ ہے۔ فریاد آزر اور اس عہد کے بیشتر شعرا ماحولیات کے تحفظ کا شعور اور ماحول دوست مزاج کی تشکیل پر زور دیتے نظر آتے ہیں۔ فریاد آزر کے متن

میں یہ فکر مندی شدت کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے جس کا ایک اہم سیاق اساطیر یعنی انسان کا آرکی ٹائپی شعور ہے۔

ان کے معاصرین نے اسے اپنے متن کا بنیادی ساختیہ نہیں بنایا ہے جبکہ فریاد آزر نے لفظ سبز کا تواتر کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے نیز اس کی اساطیری اور لاشعوری جہتوں کے اظہار کے ذریعے اپنے متن کو معنی آفریں بنایا ہے۔ آیئے پہلے خالص ماحولیاتی آلودگی اور اس کے نتیجے میں کائنات پر خطرات کے بادل کیونکر منڈلا رہے ہیں اس سے متعلق ایک شاعر فریاد آزر کے انتباہ کا فنی اظہار ملاحظہ فرمائیں:

درخت اس نے سبھی کاٹ تو دیے لیکن × مرے بدن پہ ابھی میرے سر کا سایہ ہے

ورنہ ہم سانس بھی لینے کو ترس جائیں گے × سطح اوزون کو فضلات سے آزادی دے

وقت سے پہلے نہ آجائے قیامت آزرؔ۔ "گرین ہاؤس" کو بخارات سے آزادی دے

سبز لمحات سے جب ہوگی ملاقات اس کی۔ خود پہ روئے گا بہت عہد مزائیلوں کا

اے زمیں تری کشش کیوں اس قدر کم ہوگئی ہے۔ دوسرے سیاروں پر ہم آب و دانہ ڈھونڈتے ہیں

میں آسمان پہ پہنچا مگر ستانے لگی۔ مرے وجود سے لپٹی زمین کی خوشبو

بار گناہ سے زمیں جس وقت تھک گئی۔ پھر دیکھنا کہ شمس کی جانب لڑھک گئی

زمین کانپنے لگتی ہے ٹھنڈ سے تو فلک۔ سنہری دھوپ کی چادر اتار دیتا ہے

مذکورہ بالا اشعار کے خط کشیدہ الفاظ و تراکیب پر غور کرنا لازمی ہے۔ سطح اوزون، گرین ہاؤس، سبز ہاتھ، زمین، سبز لمحات، زمین کی خوشبو، سنہری دھوپ وغیرہ یہ کسی امر کا استعارہ نہیں، سفاک حقیقتیں ہیں۔ البتہ سبز لمحات، سبز ہاتھ، زمین کی خوشبو وغیرہ کو گہرے ماحولیاتی کوڈیا نشان ضرور بنایا گیا ہے۔ ان اشعار میں فطرت کا لذت آمیز بیان ہے ہی نہیں جیسے کہ بادل محبوب کی زلفیں ہوں، ندی کی لہریں محبوب کی بلکھاہٹ ہو، یہاں فطرت بجائے خود شاعری کا معروض ہے۔ راوی کا ماحولیات سے عشق اور اس کے تحفظ کی فکر مندی اس پر دھیان دینے اور فطرت میں مضمر تحیر اور زندگی کے سربستہ رازوں سے آگہی حاصل کرنے کے احساس نے ہی ان اشعار کو خلق کیا ہے۔ یہاں ایک فطرت دوست یا ماحول دوست کردار سامنے آتا ہے۔ شعر نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ اور ۸ کو ممکن ہے ادبیت کی تلاش کرنے والے نقاد شعریت سے خارج قرار دیں لیکن اسے پڑھتے وقت جس قسم کا لمحۂ فکریہ ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے وہی اس شعر کو ہمارے ذہن سے چپکا دیتا ہے اور یہی ان اشعار کے ہونے کا جواز ہے۔ یہ اشعار ہمیں ساری دنیا میں ماحولیاتی آلودگی کے سدباب کے لیے چلائی جا رہی تحریکوں سے جوڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ سید فیصل علی کے مضمون اور واشنگٹن کے Green Muslims سے بھی۔ 'سبز لمحات' اور 'سبز ہاتھ' استعاراتی جہت سے زیادہ اساطیری اور لاشعوری آرکی ٹائپی جہت رکھنے والے مرکبات معلوم ہوتے ہیں۔ سبز پری اور گلفام کی اساطیر اگر ذہن میں ہے تو آپ بڑی آسانی سے فن کار آزر کے شعر میں زمانے کے بدلنے کے احساس کے ساتھ اساطیر کیونکر معاصر ذہن سے جھانکتی ہے، اس وقت جب ہمعصر صورتحال کی سنگینی اور پیچیدگی کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ ایسی گھڑی میں اساطیر ہمارے مسائل کے حل کی طرف ہمارے ذہن کو لے جاتی ہے۔ آج ماحولیاتی آلودگی کا مسئلہ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ یہ زمین رہے گی یا نہیں، اس کی کوئی گارنٹی اب نہیں دی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ماحول دوستی کی تشکیل پر شعروادب میں آج توجہ زیادہ دی جارہی ہے۔ پہلے شعر میں اساطیر کی دیوی جن سے گلفام عموماً سیاست نہیں آنے کی وجہ سے ہار جاتے تھے، کی یاد دلاتے ہوئے آج کے دیوؤں کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہے۔ آج کے دیو آلودگی، نیوکلیر بم، کل کارخانے اور خلا میں ہونے والے ریسرچ کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ گلفام کو یا سبز پری کو پریشان کرنے والے دیو آج کے ان دیوؤں کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔

دوسرے شعر میں گلفام اور سبز پری دونوں اساطیری کردار استعمال کیے گئے ہیں۔ اس شعر کا متکلم ماحول دوستی ہے جس نے گلفام کی قسمت چرالی ہے۔ یہ دراصل صحت اور خوشحالی کا کنایہ ہے۔ سبز پری اسے ہی مل سکتی ہے جو گلفام یعنی ماحول دوست ہو۔ سبز پری دراصل متکلم کو 'بن' میں ملے گی۔ کیا خوب رعایت ہے۔ بن بھی سبز ہی ہوتا ہے گویا سارا بن سبز پری ہے۔ یعنی سبز پری اور بن دراصل سبز انقلاب کا منبع ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ اگر سبز پری یعنی ایک خوشحال انسانی زندگی مطلوب ہے تو اس کے لیے سبز انقلاب یعنی بن کے وجود اور اس کے تحفظ پر ہمیں زور دینا ہوگا۔ یہ شعر مقصدی شاعری کا کامیاب نمونہ ہے جس میں تخلیقی نشان پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے لیکن اس کا انتہائی اکہرا اظہار بھی آزر نے کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

یہ اور بات کہ سب جنگلوں میں رہتے تھے × مگر فضاؤں میں آلودگی بہت کم تھی

کوئی قاری یہ سوال کرسکتا ہے کہ سبز پری یا لفظ سبز کا ماحولیات سے کیا تعلق ہے؟ کیونکہ اس رنگ کا Ripening life پختہ زندگی اور زرخیزی سے تعلق ہے۔ اس رنگ کو ارتقا کے نئے اسلوب اور فوق فطری یعنی دوسری دنیا کا کوڈ بھی سمجھا جاتا ہے مزید برآں اسے حقیقی دنیا کی توسیع کی علامت بھی قرار دیا گیا ہے۔ آیئے اب آزر کے یہاں اس نوع کے چند اشعار پر ایک بار پھر نگاہ ڈالیں:

نئی رتوں نے ہوا کی رو سے نہ جانے کیا ساز باز کرلی

کہ سبز صدیوں سے گونجتی آرہی ندائے اذان بھی چپ

سارے منظر ایک پس منظر میں گم ہوتے ہوئے۔ سبز لمحوں کا سنہرا کارواں جلتا ہوا

جسم سے باہر سنہرے موسموں کا سبز لمس۔ روح کے اندر کوئی آتش فشاں جلتا ہوا

ہوائے شفقت چھری بھی والد سے چھین لیتی۔ یہ سبز موسم کے ایک بیٹے کی ضد عجب تھی

'سبز لمحات' سے مراد اسلام کی وہ امن پسند صدیاں ہوسکتی جس نے عورت، پیڑ، بوڑھا اور بچوں کے لیے انوکھی انسانیت پسند آئیڈیولوجی کو جنم دیا تھا۔ 'سبز ہاتھ' انہیں کرداروں کا کوڈ معلوم ہوتا ہے جنھوں نے اس آئیڈیولوجی کے نفاذ میں حصہ لیا حتیٰ

کلام کرتا ہے اس سے دعا کے لہجے میں　　　مگر وہ بول بڑا تھا خدا کے لہجے میں

کہ اپنے ملک اوحکومت کے جھنڈے پر سبز رنگ کو ہی جگہ دی اور ایسی صحرائی ثقافت کی تشکیل ہوئی جہاں فطرت دوستی کو مرکز میں رکھا گیا تھا۔آزر کے یہاں زمین یعنی دھرتی ؐؐ 'GIA' سے متعلق اشعار میں بھی یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ اس زمین پر پھر اسی طرح ہریالی چھائے گی جس طرح کہ جنگلوں میں ہوتا ہے۔زمین کی کشش کے ختم ہونے کے ملال کے ساتھ زمین کی خوشبو یعنی اس سے انسان کے لاشعوری رشتے کی طرف توجہ منعطف کر کے زمین کے تحفظ کے جذبے کو ابھارا گیا ہے۔فریاد آزر کے یہاں ماحول دوستی اور فطرت کے تحفظ کے حوالے سے اور بھی اہم اور قابل غور اشعار ان کے شعری مجموعوں میں آپ کو ملیں گے طوالت کے خوف سے کچھ ہی اشعار پر یہاں گفتگو کی گئی ہے۔آپ نے دیکھا کہ ان کے یہاں وافر مقدار میں سبز لفظ کا استعمال کیا گیا ہے۔مغرب میں Lady Raglan نے سبز آدمی کی اصطلاح 1939 میں استعمال کی تھی۔سبز آدمی کے بال اور داڑھی پتے نما ہوتی ہے۔کبھی سر پوری طرح پتوں سے ڈھکا ہوتا ہے اسی طرح فنتاسیوں میں سبز آدمی کچھ اسی طرح کے حلیے میں نظر آتے ہیں۔ہندوستان کے جین مندروں میں اس نوع کی تصویریں کھدائی کے بعد ملی ہیں حتیٰ کہ عراق میں بھی جن کے لباس اور گہنے حتیٰ کہ سر پر نباتات ہی نباتات دیکھے جاسکتے ہیں۔

TomCheethan (جو اسلامی تصوف کا بڑا اسکالر تسلیم کیا جاتا ہے) نے 'خضر' کو سبز آدمی قرار دیا ہے۔کچھ لوگ ابن عربی کو سبز آدمی کا تصور دینے والا پہلا اسکالر مانتے ہیں۔ہندوستانی اساطیر میں سبز آدمی کو شیو کی لیلا قرار دیا گیا ہے۔فریاد آزر نے بھی لاشعوری طور پر شیو کے نیلے کنٹھ کا بار بار ذکر کیا ہے:

سبھی کو زہر اپنے حصے کا پڑا پینا۔ نئی تہذیب نے شاید کوئی شنکر نہیں پایا
زہر کا رنگ اس کے بھی ہو جاتا حیرت سے سفید۔ گر کبھی نیلا سراپا میرا شنکر دیکھتا

سبز آدمی جسے شیو کی لیلا بھی قرار دیا گیا ہے آزر نے شیو اور اس کے زہر کے حوالے سے کئی اشعار کہے ہیں جس کا سیاق آج کی مسموم فضا ہے جس میں ہر نوع کا زہر گھل چکا ہے اور اس آلودگی کو ہر دور میں شیو ہی ختم کرسکتا ہے یعنی سبز کو برقرار رکھنے کے لیے شیو کو زہر پی کر نیلا ہونا پڑتا ہے:

ہزاروں ابرہہ لشکر سجا رہے ہیں تو کیا۔ ہوائے سبز ابابیل ہونے والی ہے
یہ قیامت کی علامت ہے یا کوئی انقلاب۔ سبز پیڑوں کے ہرے پتے بھی نیلے ہو گئے
گزشتہ دور کی بو باس لے کے آئی تھی۔ میں رات سبز ہوا سے لپٹ کے روتا رہا
تمام سبز بدن پیڑ بھاگ جائیں گے۔ یہاں جو شہر کے لوگوں کو میں بلا لوں گا
وہ سبز ہاتھوں میں لے کر کتاب اترے گا۔ اب اس زمیں پہ حسیں انقلاب اترے گا
سرسبز موسموں میں ہی مانند برگ خشک۔ اندھی ہوا کی شہہ پہ بکھرنا پڑا مجھے
دی گئی لامنظری کی سبز آنکھوں کو سزا۔ ان پر موتی رولنے کا جرم عائد ہو گیا

فریاد آزر نے جنگل کے امیج کو بار بار قاری کے ذہن میں لانے کی کوشش کی ہے اور استعارے کی شکل میں نہیں خالصتاً ماحولیات کے منبع کے طور پر اسے پیش کیا ہے کیونکہ جنگلوں میں رہنے والے لوگ ہی دراصل صحیح معنوں میں سبز آدمی (Green Man) تھے اور عورتیں سبز پری یا عورت اس لحاظ سے سبز، خوشی، ارتقا اور شگفتگی و شادابی کا کوڈ رہا ہے:

حسین شہر کا منظر اسے بلاتا رہا۔ مگر وہ شخص ہرے جنگلوں میں کھویا رہا
آگ جنگل میں لگا دیتے ہیں بدمست درخت۔ بے گناہی کی سزا پاتے ہیں پورے معصوم

الغرض سبز لفظ کا استعمال جن اشعار میں آزر نے کیا ہے ان میں ایک ایسا راوی یا کردار نظر آتا ہے جس کے اپنے کچھ تعصّبات ہیں یا تحفظات ہیں۔یہ اقلیتی طبقے کا ایک انقلابی ذہن یا احتجاج پر آمادہ ذہن ہے جس نے سبز لفظ کو عموماً اسلامی روایات یا اسلام کے اصولوں کا کوڈ بنایا ہے۔لہٰذا مذکورہ بالا اشعار میں سبز صدیاں، سبز موسم، ہوائے سبز، سبز ہوا، یہ ساری اردو تراکیب اسلام کے شاندار ماحول دوست انسانیت پسند اصولوں یا آئیڈیولوجی کا کوڈ بن جاتے ہیں۔انہیں اپنی شاعری میں بروئے کار لانے کی ایک وجہ آزر کے نزدیک یہ ہو سکتی ہے کہ شعری کردار سبز پسند یعنی انقلاب کا متلاشی ہے اور اسلام کی آئیڈیولوجی اسے سبز انقلاب کے اہم حوالے کے روپ میں نظر آتی ہے۔اس بہانے ان کی غزلیہ شاعری میں اسلام کی عصری معنویت کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مثلاً خزاں میرا موسم جو ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے کے مذکورہ بالا اشعار میں ابرہہ کے لشکر کا ذکر، 'ہوائے سبز' جو ابابیل ہونے والی ہے کا مژدہ سنانا دراصل ماضی کی اسی شاندار روایت کی واپسی کا سیاق سامنے لاتا ہے۔

آزر کے نزدیک سبز پیڑوں کے پتوں کے پیلے ہونے کا مطلب ہے قیامت کے آنے کا اشارہ۔یعنی قیامت نام ہے ماحولیات کی آلودگی کا۔'خزاں میرا موسم' کے تیسرے شعر میں سبز ہوا سے لپٹ کے رونے کا ذکر اور آخری شعر میں شہروں کو ماحولیاتی آلودگی کی وجہ قرار دینا یعنی شہر کے لوگ جیسے ہی کہیں کسی گاؤں میں پہنچتے ہیں سبز بدن پیڑ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔کہنے کی یہ سعی کی گئی ہے کہ شہروں کی تشکیل ہی نے ماحولیاتی آلودگی کو جنم دیا ہے کیونکہ ترقی کے نام پر ہم جنگلوں کو کاٹ رہے ہیں۔اسی طرح 'قسطوں میں گزرتی زندگی' سے ماخوذ اشعار کے پہلے شعر میں کس نوع کے انقلاب کے آنے کا مژدہ سنایا گیا ہے؟ ترقی پسند لوگ لال انقلاب کی دہائی دیتے تھے آج کے شاعر کے نزدیک اس سے زیادہ ضروری سبز انقلاب قرار پایا ہے۔دوسرے شعر میں ماحولیاتی پیکروں کو انسان کی اپنی زندگی کی ٹوٹ پھوٹ کا استعارہ بنایا گیا ہے۔آخری شعر میں آج کے انسانوں کی محرومی کی وجہ بنجر پن ہے جن کی آنکھیں حسین منظروں کے لیے ترس رہی ہیں۔

سبز لفظ پری سے وابستہ رہا ہے۔سبز پری کا عالمی ادب میں بالخصوص اسکاٹ لینڈ کے ادب میں پری کو کنایے کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان رہا

ہے۔ ہمارے یہاں اندر سبھا میں سبز پری (نسوانی کردار) اور گلفام کا کردار ملتا ہے۔ فریاد آزر نے بھی سبز پری کو کنایے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ فریاد آزر نے اسلام کی ایک ایسی خوبی کو اپنے شعری جہان کے ذریعے ہمارے ذہن کا حصہ بنایا ہے جو فی زمانہ دنیا کے ہر ملک اور ہر انسان کی فکرمندی بن گئی ہے یعنی ماحولیاتی آلودگی اور اس کے لیے سبز انقلاب لانے کا جتن کرنا آج کے ہر بیدار مغز انسان کے لیے عبادت کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ اسلام کی بہت سی خوبیاں ہیں مگر فریاد آزر نے اپنی شاعری میں اسلام کی اس انوکھی خوبی کو سامنے لا کر اسے غزل کی شاعری میں جس خوبی سے شعری صداقت کا حصہ بنایا ہے اس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اسلام سبز رنگ کو یونہی پسند نہیں کرتا اس کے عقب میں ماحولیات کے تحفظ کا ایجنڈا کارفرما ہے۔ فریاد آزر کی شاعری کا یہ لفظ جو اساطیری استعاریت کی صورت میں ایک اہم ساختیہ بن گیا ہے ہماری شعری روایت کا حصہ رہا ہے اور اس شعری روایت کا حصہ ہے جس کا راست تعلق اردو سے ہے۔ میرا اشارہ فارسی شاعری کی جانب ہے۔ خسرو کی غزل سے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

از یں ہر دو نکوتر رنگ سبز است ۔ کہ زیب اختراں زاور نگ سبز است

(ان دونوں سے بہتر سبز رنگ ہے (آگے گندمی سیاہ رنگ کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ جس سے تاروں کی زینت ہے وہ آسمان بھی سبز ہوتا ہے)

برنگ سبز رحمت، ہا سرشت است ۔ کہ رنگ سبز پوشان بہشت است

(سبز رنگ میں رحمتیں گوندھ دی گئی ہیں دیکھ لو کہ جنتی لوگوں کا لباس سبز ہوتا ہے)

(ظ انصاری، خسرو کا ذہنی سفر، انجمن ترقی اردو ہند، پہلا ایڈیشن (1977) انتخاب کلام مع ترجمہ: مولانا حسن عباس فطرت شاعر پونہ) ص: 17)

فریاد آزر نے اپنی شاعری میں سبز رنگ کی معنویت کو مزید آشکار کرنے کے لیے زندگی کے دوسرے رنگوں کو بھی پیش کیا ہے۔ نیلا رنگ جو زہر نگل جانے کے بعد نمودار ہوتا ہے کے ساتھ ساتھ انہوں نے سنہرے رنگ کا ذکر اپنے شعروں میں اس کے اپنے اساطیری سیاق میں کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کیا المیہ ہے سنہرے موسموں کے کارواں کا۔ سب سفر میں ہیں کسی کا ہمسفر کوئی نہیں ہے

سنہرے شہر کی تعلیم تھی بہت دلچسپ۔ کہ بے حسی بھی وہاں شامل نصاب رہی

سنہرے نازوں میں پل رہی ہیں بہک نہ جائیں۔ ذرا حنا خواہشوں کی بھی دیکھ بھال رکھنا

جب ملا تبدیلئ تاریخ کا موقع اسے۔ نام خود اپنا سنہرے اکشروں میں لکھ دیا

جب چاند تارے جگنو سبھی نور کھو چکے۔ مانند آفتاب ابھرنا پڑا مجھے

رفاقتوں کا سنہرا جال دینا تھا۔ ہمارے عہد کو ماضی سا حال دینا تھا

میں زندگی کا سنہرا نصاب لاؤں گا۔ تمہارے چہرے سے اچھی کتاب لاؤں گا

لفظ 'سنہرا' کا استعمال سبز ہی کی طرح تواتر کے ساتھ فریاد آزر نے اپنی غزلوں میں مختلف سیاق وسباق میں کیا ہے۔ سورج کی اساطیر اور آریائی تصور کے مطابق سورج کے بال سنہرے ہوتے ہیں۔ سنہرا لفظ کا تعلق سونا سے بھی ہے۔ صبح کی سنہری کرنیں رات کی قربانی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ رات صبح کی بہن ہے جسے سنہرے زیور پہننے کا شوق ہے۔ دراصل سوریہ رات یعنی اپنی ماں کا سینہ چاک کر کے یعنی اندھیرے کو کاٹ کر دنیا کو روشن کرتا ہے۔ ان سنہری کرنوں کے ساتھ سورج دراصل سحر کی تلاش میں صدیوں سے بھٹک رہا ہے اور اس طرح دنیا کو خوشحالی اور سنہری صبحیں عطا کرتا چلا جا رہا ہے۔ دراصل سنہرے رنگ میں پیلے کا ہونا زندگی کی علامت ہے۔ اگر اس موقع پر رابرٹ فراسٹ کی مندرجہ ذیل لائنیں بھی ذہن میں رہیں تو آزر کے یہاں مستعمل لفظ 'سنہرے' اور 'سبز' کے فنی معنیاتی تعلق تک رسائی حاصل کرنے میں اور آسانی ہو جائے گی۔ رابرٹ فراسٹ کو سنیے:

"Nature's first green is gold,
Her hardest hue to hold
Her early leafs a flower;
But only so and hour;
Nothing gold can stay

(Robbert Frost)

فراسٹ نے کتنی خوبصورتی کے ساتھ سنہرے اور سبز کے وصال کو فطرت کا پہلا سبز قرار دیا ہے۔ اس کی پہلی پتی کو پھول کہا ہے۔ یعنی فطرت کی پہلی سنہری روشنی کی تمنا کر رہا ہے جس کی وجہ سے سبز کی زندگی ہے۔ اس تناظر میں یہاں آزر کے کم از کم ایک شعر پر نگاہ ڈالنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

کیا المیہ ہے سنہرے موسموں کے کارواں کا ۔ سب سفر میں ہیں، کسی کا ہمسفر کوئی نہیں ہے

ایسا لگتا ہے کہ مذکورہ بالا سنہرے لفظ کی توضیح وتشریح اور سورج کی اساطیر اس شعر کا آرکی ٹائپی نقش ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ سورج سحر کی تلاش میں نامعلوم زمانوں سے سفر میں ہے۔ رات نامعلوم زمانوں سے سورج کو اپنے گربھ میں رکھتی آئی ہے اور سفر میں ہے۔ ستارے، چاند اور خود سحر بھی۔ کیا خوب مصرعہ ہے، "سب سفر میں ہیں کسی کا ہم سفر کوئی نہیں ہے"۔ سحر آتی ہے تو رات چلی جاتی ہے، شام آتی ہے تو دن چھپ جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر میں اس المیہ کو سامنے لا کر شعری کردار نے کیا کہنا چاہا ہے۔ شاید یہ کہ اشارہ ایک ایسی شاندار قوم اور اس کے کارواں کا پوری دنیا میں پھیلنا ہے جس کی پہچان اجتماعیت تھی۔ یعنی آج کے مسلمان جو نماز جمعہ، با جماعت نمازوں، عیدین اور نہ جانے ایسے کتنے ہی موقعوں پر وہ ایک ایسی جماعت کی صورت میں نظر آتے ہیں جن میں احساس اجتماعیت اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ دم توڑ چکا ہے۔ معنی کا ایک اور قرینہ اس شعر سے سامنے آتا ہے جو عصر حاضر کے انسانوں میں اپنی ذات کے خول میں بند ہو جانے جیسی منفی قدر کی نشان دہی کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی کا یعنی مل جل کر رہنے کا صدیوں پرانا انسانی وصف آج کے صارفی سماج میں اپنی اپنی ڈفلی اور اپنے اپنے راگ کی صورت میں بکھر گیا ہے۔

رنگ سبز اور ماحولیاتی تحفظ آج کی اتنی اہم بحث بن چکی ہے کہ تنقید کا

ایک نیا اسکول سبز تنقید (Green Criticism) وجود میں آ گئی ہے۔اردو میں اس حوالے سے راست طور پر پہلا متن فریاد آزر نے ہی خلق کیا ہے۔علاوہ ازیں لفظ 'خلا' بھی ان کی شاعری میں بار بار استعمال ہوا ہے جس سے نہ کہ ماحولیات بلکہ ہم عصر زندگی کے تضادات، خطرناکیوں کی نشان دہی میں مدد ملی ہے:

(۱) کشش تو چاند سے کچھ کم نہیں ہے اس میں بھی۔مگر وہ ملتا ہے مجھ سے خلا کے لہجے میں
(۲) میں تھک چکا ہوں اور آخری صدا میری۔انہیں خلاؤں میں تحلیل ہونے والی ہے
(۳)　عجب جستجو ہے خلاؤں میں بھی زندگی ڈھونڈتا پھر رہا ہوں
سمندر کی لہروں پہ میں نقش دریا دلی ڈھونڈھتا پھر رہا ہوں
(۴)　حصار کائنات سے نکل کے ڈھونڈتے تجھے
مگر خلا سے آگے کوئی راستہ نہیں ملا

(خزاں میرا موسم)

(۱) تخیلات میں پھر تاج و تخت اگنے لگے / زمیں ہٹی تو خلا میں درخت اگنے لگے
(۲) خلاؤں میں کبھی پھرتا ہوں آزر / کبھی میں چاند پر دیکھا گیا ہوں
(۳) خلاؤں میں بھی شر پھیلا رہا ہے۔پرندہ کتنا پر پھیلا رہا ہے

(قسطوں میں گزرتی زندگی)

'خلا' کا استعمال بطور ماحولیاتی فکر مندی خزاں میرا موسم کے شعر نمبر (۲)(۳) میں ہوا ہے اور یہ تو اب واضح ہو چکا ہے کہ آج کا انسان بارود کی ڈھیر پر بیٹھا ہوا ہے اور آخری سانسیں گن رہا ہے۔تباہی کے بعد وہ خلا میں آواز کی صورت محفوظ رہ جائے گا یہ ایک سائنسی حقیقت ہے۔انسان کی خواہشیں لامتناہی ہیں۔زمین تا خلا وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ ڈھونڈنے میں مصروف ہے۔تیسرے شعر میں طنز ہے اور وہ یہ کہ انسان کی یہ کون سی تحقیق ہے کہ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتا کہ بعض اشیا کی تحقیق اسے بجائے فائدے کے نقصان پہنچائے گی اس خیال کو شعر کے دوسرے مصرعے میں سمندر کی لہروں پہ نقش دریا دلی ڈھونڈھنے جیسے واقعے سے واضح کیا گیا ہے۔یہاں دریا دلی اور لہروں میں مناسبت قابل داد ہے۔قسطوں میں گزرتی زندگی کے شعر (۱) میں انسان کی ہوسنا کی اور خواہش بے جا کا مضمون قلم بند ہوا ہے دوسرے شعر میں بھی انسان کی لگاتار کوششوں اور فطرت کو مسخر کرنے کا سیاق ابھارا گیا ہے اور تیسرے شعر میں بھی انسان کی اسی ہوسنا کی اور بے جا ترقی اور اس نام پر کی جانے والی تحقیق کے نتائج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اب تو خلا کو آلودہ کرنے میں سائنس دانوں نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔یہاں ٹھہر کر ایک اور اہم پہلو پر غور کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ آزر نے فطرت کے ایک وسیع و عریض منظر 'صحرا' کو اپنی شاعری کا اہم ساختیہ بنایا ہے۔صحرا کی خوبی یہ ہے کہ اس پر ثقافت کی کائی بہت جلد نہیں جمتی۔یہ زمانوں تک رہنے کے قابل نہیں ہوتا۔ماحولیاتی مفکرین اسے خالص فطرت کے ذیل میں رکھتے ہیں لیکن آج یہ بھی گلوبل وارمنگ سے اثر انداز ہو چکا ہے۔ایسا فکشن کہ جس میں زندگی کے گہرے رازوں کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہو یا ایسی شاعری جس میں تقدیر کے المیے کو پیش کیا گیا ہو صحرا وہاں اظہار کا ایک گہرا ساختیہ بن جاتا ہے۔دنیا کے نبی، اوتار عبادت کے لیے صحرا میں گئے اور انہیں زندگی کے راز سربستہ سے آگہی حاصل ہوئی۔اس امر کا احساس اقبال کو بھی تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ''

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی × یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی

اقبال کے اس شعر کا مطلب اتنا ہی ہے کہ صحرائی انسان ہی فطرت کے مقاصد کی سمجھ رکھتے ہیں۔اس لفظ کا ایک سیاق اسلام اور اس کے ذریعے دنیا میں قائم ہونے والی ثقافت سے متعلق تلازمہ بھی ہے:

اب تو وحشت بھی بدلنے لگی منزل اپنی۔شہر کی اور بڑھے آتے ہیں صحراؤں کے لوگ
صحرا سے العطش کی صدا آ رہی ہے پھر۔تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے پھر
اب بھی ہیں صحرا کی آنکھوں سے یوں ہی آنسو رواں۔نام ان کو دے دیے ہیں وقت نے دجلہ فرات

(قسطوں میں گزرتی زندگی)

پہلے شعر میں وحشت اور صحرا ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔مابعد جدید غزل میں شہر اور دیہات کا تقابل اظہر من الشمس ہے۔مابعد جدید غزل کا راوی شہر سے نفریں اور گاؤں کے ختم ہونے پر حد درجہ فکر مند نظر آتا ہے۔اس امر کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کہ کیونکر اب صحرا بھی اپنی فطرت بدلنے لگا ہے۔اس بات کی طرف فنی طریقے سے فریاد آزر نے بھی اشارہ کیا ہے۔دوسرے اور تیسرے شعر میں ماضی کے لوٹ آنے کی طرف صحرا کے حوالے سے ایقان کا اظہار کیا گیا ہے۔ہم اگر فریاد آزر کا غزلیہ متن پڑھیں اور اب تک کی گفتگو کو دھیان میں رکھیں تو یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فریاد آزر نے ماقبل بیانیہ یعنی اساطیر کی ردتشکیل کا متن بنانے میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ دلچسپی لی ہے۔ان کے زیادہ تر اساطیر اسلامی ہیں۔ظاہر ہے کہ انہوں نے اس اساطیر کے ذریعے حال کے تضادات کو پرانے اور نئے کے فرق کو واضح کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نوحؑ کی امت ہے کاغذ کی سبک کشتی میں اور۔خواہشوں کا ایک بحر بیکراں جلتا ہوا
ذرا سی دیر میں دیوار قہقہہ آزر۔فصیل گریہ میں تبدیل ہونے والی ہے
کوئی ہابیل صفت شخص نہ بچنے پائے۔یہ ہے اعلان مرے شہر کے قابیلوں کا
عجیب طور کی مجھ کو سزا سنائی گئی۔بدن کے نیزے پہ سر رکھ دیا گیا اپنا
زمین پھر اسی مرکز پہ جلد آ جائے۔ندائے کن میں سنوں ابتدا کے لہجے میں
پرندے لوہے کے اب کنکری گرانے لگے۔عذاب ہم پہ ہے کیوں ابرہہ کے لہجے میں
کیا سویمبر رچائے دھنک بک گئی۔آج سیتا کی خاطر جنک بک گئی
کس نے دل میں آگ لگائی۔کون آیا لنکا کے اندر

طوفان نوح اور نوح کے ذریعے بنائی گئی کشتی کا قصہ کسے معلوم نہیں۔حد درجہ گہرا شعر ہے۔طوفان نوح میں نوح کی کشتی رواں دواں ہے۔اس میں تب دنیا کے جانداروں

کے ہر جوڑے سنبھال کر رکھے گئے تھے۔آج کی دنیا ہی طوفان نوح بن گئی ہے اور کشتی میں خواہشوں کا طوفان لہریں لے رہا ہے۔اشارہ انسان کی بے لگام خواہشوں کی طرف کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک بار پھر دنیا تباہی کے دہانے پر ہے لیکن اس بار نہ نوح کی امت سبک کشتی میں ہے اور نہ امت کی فکر کرنے والے نوح۔اسی طرح دوسرے شعر میں دیوار قہقہہ کی اساطیر کے سہارے زندگی میں اچانک ہونے والی تبدیلیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔تیسرے شعر میں ہابیل جسے قابیل نے مار دیا تھا اور جسے دفن کرنے کا طریقہ فطرت (کوا) نے سکھایا تھا دراصل قابیل کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس نے ہابیل کا قتل کیا ہے۔آج کا قابیل سب کچھ جانتے ہوئے نہ کہ اپنے بھائیوں کو مار رہا ہے بلکہ وہ ہابیل صفت کوئی انسان اس دھرتی پر نہ رہے اس فکر میں بھی مبتلا ہے۔اسی طرح سے ندائے کن ،بدن کے نیزے، لوہے کی کنکری کا گرانا،سویمبر ،سیتا، جنک اور آخری شعر جس کا سیاق اردو غزل کا اہم ایجنڈا عشق ہے اس نا قابل بیان اور نا قابل تفہیم جذبے کی تصویر کشی کے لیے جس طرح سے اساطیر کو آرکی ٹائپی پیکر میں بدلا گیا ہے اس کی داد جتنی دی جائے کم ہے۔اس شعر میں غزل کا روایتی رنگ سر چڑھ کر بولتا نظر آتا ہے۔تجاہل عارفانہ نے کہ 'کون آیا لنکا کے اندر ×اور کس نے دل میں آگ لگائی' کمال کا شعری اظہار ہے۔لنکا کو دل کہنا جدت کی عمدہ مثال ہے۔دراصل دل لنکا ہے نہیں کیونکہ لنکا تو راون کی نگری ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ لنکا کی یاد آ گئی ہے کیونکہ محبوب جیسے ہی دل میں آیا ایسی آگ لگی کہ دنیا ہی بدل گئی۔ویسی ہی آگ جیسی ہنومان نے لنکا میں سیتا کی خاطر لگائی تھی۔اس شعر پر جتنی بھی گفتگو کی جائے کم ہے۔آیئے فریاد آزر کے کچھ ایسے اشعار پر نظر ڈالیں جن کی تعداد قابل ذکر ہے اور جن میں معنی آفرینی اور تہہ داری کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے یا جسے قاری اپنے اپنے طور پر مختلف النوع انداز سے معنی اخذ کرنے میں خود کو لطف محسوس کرتا ہے۔ایسے اشعار اور ان کے مضامین ہر نوع کے ہیں۔آیئے کچھ عشق کے تہذیبی و تخلیقی رنگ میں ڈوبے اشعار اور کچھ غم زمانہ کو سمجھنے اور سمجھانے والے گہرے اشعار پر ایک نگاہ ڈالیں:

ہزار چاہا کوئی اور صنف اپناؤں ۔میں شاعری کو غزل سے جدا نہ کر پایا

اپنے ہی معنی کا لفظوں پر اثر کوئی نہیں ہے۔مستند کتنے بھی ہوں اب معتبر کوئی نہیں ہے

مجاز کا سنہرا حسن چھا گیا نگاہ پر۔کھلی جو آنکھ جلوۂ شہود ختم ہو گیا

یہاں فرار کی راہیں تو ہیں مسدود۔کہاں کو جائے کوئی کائنات سے بچ کر

ہوا وجود مٹا دے گی ایک لمحے میں ۔یہ کس نے پھوس کے گھر میں دیا جلایا ہے

تنفس اک مسلسل خودکشی کا نام ہے شاید۔میں جتنا جیتا ہوں اتنی نفی محسوس ہوتی ہے

یوں تو محفوظ رہے ذہن میں لاکھوں الفاظ۔ یاد آیا نہیں دروازہ کھلا کس سے تھا

کچھ تو پانی کی لکیروں پہ لکھا ہے، کیا ہے؟۔زندگی آگ ہے مٹی ہے، ہوا ہے، کیا ہے؟

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا۔رکے تو پانو سے آگے نکل گئی صدیاں

وہ شاید خواب میں دوبارہ آئے۔ مجھے اک بار پھر سونا پڑے گا

پہلے شعر پر نظریاتی بحث گھنٹوں چھڑ سکتی ہے کہ کیوں ہزار کوششوں کے بعد ایک شاعر یا ایک قاری غزل ہی پسند کرتا ہے۔دوسرا شعر ساختیاتی اور پس ساختیاتی تناظر میں لفظ و معنی کی تھیوری کی طولانی بحث کا متقاضی ہے۔شاعر کو علم ہے کہ کسی لفظ کے اس کے اپنے معنی ہوتے ہی نہیں کیونکہ ہر لفظ کے معنی ایک لفظ ہے۔تیسرا شعر وجود اور شہود کی صدیوں پرانی بحث کو نئے طریقے سے قاری کے ذہن میں لایا گیا ہے۔وجود اور شہود کا فرق تبھی تک ہے جب تک سالک وجود کی منزلوں میں یعنی مجاز کے سنہرے حسن کے اثر میں ہوتا ہے۔جیسے ہی سالک مسلوک سے جا ملتا ہے جلوۂ شہود ختم ہو جاتا ہے۔یعنی بندے اور خدا کا فرق اعتباری ہے حقیقی نہیں۔

چوتھا شعر پڑھتے ہی ذوق کی یاد آتی ہے۔کہتے ہیں کہ 'اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے × مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے' لیکن آزر نے اس شعر میں ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے جس کا تجربہ یہ ہے کہ دنیا ایک ایسا قید خانہ ہے جس میں انسان چاہے نہ چاہے رہنا ہی پڑتا ہے۔کائنات سے بچنے کے لیے کسی پانچویں سمت کی تلاش بے سود ہے۔کہا یہ ہے کہ دنیا سے نفرت اس سے بھاگنے کی کوشش بے سود ہے۔ ہر حال میں دنیا کرنی پڑتی ہے۔آٹھویں شعر کو پڑھ کر بیک وقت غالب اور فانی یاد آتے ہیں۔فانی کے نزدیک زندگی دیوانے کا خواب ہے، آزر کے نزدیک زندگی کے بارے میں اگر کچھ کسی نے بیان دیا ہے یا لکھا ہے کہ زندگی کیا ہے تو افسوس کہ اس نے کاغذ کے بجائے یہ باتیں پانی پر لکھی ہیں۔غور کیجیے کہ بھلا پانی پر تحریر کی گئی کسی حقیقت کو بھلا کون پڑھ سکتا ہے۔دوسرے مصرع میں سوال کی تکرار زندگی کی بے معنویت کی طرف نہیں ہمیں زندگی کی گہرائیوں کی طرف لے جاتی ہے۔چھٹے شعر میں تنفس کو یعنی آتی جاتی سانسوں کو خودکشی کا نام دینا بلیغ استعارہ ہے۔کیونکہ زندگی کی ہر سانس ہمیں موت کی طرف لے جاتی ہے۔انسان ہر لحہ نفی کے غار میں لڑھکتا ہوا خود کو محسوس کرتا ہے۔ساتویں شعر کو پڑھ کر علی بابا اور مرجینا کی اساطیری کہانی کی یاد آتی ہے۔جسے اس شعر میں گوندھ کر پیش کیا گیا ہے۔یہ ایک عجیب و غریب شعر ہے جس کی تعبیر کی کوشش کسی ایک طور پر ممکن نہیں۔شعر میں لفظ دروازہ آیا ہے۔کہانی میں یہ خزانے کا دروازہ تھا جسے کھولنے کے لیے ہر شخص کو کھل جا سم سم کہنا پڑتا تھا۔کہانی کے کردار کو اس لفظ کے بھول جانے کی وجہ سے کیا کیا پریشانیاں ہوئیں تھیں بتانے کی ضرورت نہیں۔اس اساطیری کہانی کی ردتشکیل کرتے ہوئے شاید یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم دنیا میں آتے ہیں اور یہاں کے طرح طرح کے عیش و آرام میں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔شاید ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہم وہ ایک لفظ بھول جاتے ہیں۔وہ لفظ دراصل دنیا کا بنانے والا ہوسکتا ہے، انسان کا ضمیر ہوسکتا ہے، انسان کی انسانیت ہوسکتی ہے۔یہ اور اس طرح کی اور بھی امور اس شعر کے حوالے سے قارئین سامنے لا سکتے

ہیں۔طوالت کے خوف سے آخری شعر پر اپنی گفتگو ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا۔جس میں وہ شاید خواب میں دوبارہ آئے کے 'وہ' کو ڈی کوڈ کرنا ضروری ہے اور 'مجھے ایک بار پھر سونا پڑے گا' میں فعل 'سونا' کو سونا پر غور کرنا از حد ضروری ہے۔ظاہر سی بات ہے کہ غزل کا بنیادی ایجنڈا عشق و محبت اور احترام آدمی اور روحانی ہم رشتگی ہے۔'وہ' واحد غائب کون ہے؟ ظاہر سی بات ہے کہ محبوب ہے۔چونکہ ہجر کی راتوں میں محبوب سے ملنے کا وسیلہ
خواب ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اس خواب کی وجہ سے انسان جاگ بھی جاتا ہے۔یعنی ہجر کا مارا عاشق حقیقت کے بجائے خواب میں ہی جینا زیادہ پسند کرتا ہے۔'مجھے ایک بار پھر سونا پڑے' مصرعے کے ذریعے یہی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔غزل کی اشاریت اور رمزیت اور اس میں کچھ کھو جانے اور کچھ پا لینے کا انداز اشعار میں لطیف ایمائیت پیدا کر دیتی ہے۔

شعر میں معنی کے اور بھی قرینے ڈھونڈے جا سکتے ہیں اور یہی زندہ اور تہہ دار اشعار کی پہچان ہوتی ہے۔

اخیر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ فریاد آزر نے اپنی شاعری میں رنگوں کے استعارے کے ذریعے ہم عصر زندگی کے مختلف رنگوں کو پیش کیا ہے۔اساطیری استعاریت کے ذریعے ماضی اور حال کی کشمکش کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی ہے۔ان کے عشقیہ رنگ کی شاعری میں زمینی اور مقامی رنگ کو نمایاں مقام عطا کیا گیا ہے۔معاصر ثقافتی صورتحال اور عام آدمی کا شہر میں کیسا برا حال ہو گیا ہے اس دکھ کو زبان دینے کی کوشش کی گئی ہے اور فطری انسان کی معصومیت کی تلاش کے جذبے نے فی زمانہ ماحولیاتی آلودگی کو انہیں ہم عصر زندگی کا سب سے بڑا خطرہ تصور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ان کی غزلیہ شاعری میں بارود کی ڈھیر پر بیٹھی اس دنیا کے تحفظ کے لیے شانتی اور امن کے پجاری یعنی ایک ایسی سبز آدمی کی تلاش پر حد درجہ زور دیا گیا ہے۔اردو میں مقصدی شاعری کرنے والے شعرا ہمیشہ ناقدین کے نشانے پر رہے ہیں۔آزر کی شاعری کی ایک اہم موتیف اپنے مذہب اور قوم کی زبوں حالی کا تجزیہ ہے۔اس لحاظ سے آزر کی شاعری بھی مقصدی شاعری کے خانے میں چلی جاتی ہے لیکن یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فی زمانہ جس نوع کی شاعری ہو رہی ہے اس میں فریاد آزر ایک اہم غزل گو شاعر کی حیثیت سے ۸۰ کے بعد کی غزلیہ شاعری میں ناقابل فراموش شاعر کی حیثیت سے زبان زد خاص و عام بن چکے ہیں۔☆☆

(''فریاد آزار: شگفتہ خیال شاعر'' کا بقیہ)

درج ذیل ہیں

آزما کر عالمِ ابلیس کے حربے جدید۔ہو گئے قابض مری صدیوں پہ کچھ لمحے
دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہدِ قدیم۔رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے عہدِ جدید

کیوں نہیں لے جاتی اب وحشت بھی صحرا کی طرف۔بن گیا کیوں شہر از خود آج صحرائے جدید
محل نظر ہے کہ لمحے جدید، حربے جدید کے ساتھ حرف اضافت کے ساتھ دور جدید کو محض صوتی ہم آہنگی کے باعث ہم قافیہ بنایا گیا جو قابل قبول نہیں۔قوافی کے صوتی نظام میں اس جارحانہ دخل اور غیر ضروری چھیڑ چھاڑ کے عمل سے گریز بہتر تھا۔خوش بیانی، پرکاری اور معنی آفرینی کلام آزر کی قابل ذکر خصوصیات ہیں۔عملی طور پر انہوں نے روایت سے قطعی انحراف نہیں کیا ماسوائے مذکورہ بالا غیر صحیح اور ناگوار ضابطہ شکنی کے، جو تجربے کے نام پر ان کے کلام میں گاہے بگاہے در آئی ہے۔ بلکہ انہوں نے جدید فکری نظام کی شجر کاری کی ہے۔

فریاد آزر نہایت شریف الطبع انسان ہیں۔کاہلی اور سست رفتاری ان کی زندگی کا حصہ ہے۔دراصل عملی طور پر وہ جس کام کو کرتے ہیں اسے اطمینان اور سکون سے کرتے ہیں۔ان کے شعری موضوعات کے تنوع کی رنگارنگی ان کی شعری کائنات۔ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا۔رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں
تمام عمر ہمیں منزلیں نہیں ملتیں۔ہم اہلِ درد سدا راستے میں رہتے ہیں
اس سادہ دل سے مل کے مجھے بھی یہی لگا۔اب تک میں جی رہا تھا دکھاوے کی زندگی
ملی تھی جب اسے جنت تو خوش نہ تھا اتنا۔وہ جتنا خوش ہے مجھے دیکھ کر جہنم میں
وہ شخص آج بھی ماضی سے ایسا الجھا ہے۔کہ اس کے پاؤں جنت میں' ست جہنم میں
صبح ہوتی ہے تو دفتر میں بدل جاتا ہے۔یہ مکاں رات کو پھر گھر میں بدل جاتا ہے
ننھے بچپن میں تھا بزرگوں سا جس کا رکھ رکھاؤ۔زندگی کی دوڑ میں وہ آدمی بچہ لگا
اس قدر سبز درختوں کو نہ کاٹو کہیں۔سانس لینے کو ترس جایے ہوا بے چاری
ہیں پستیاں ہی مودر' بلند ہوتے ہویے۔میں خواب دیکھوں حقیقت پسند ہوتے ہویے
یہ کیسے جرم کی پاداش ہے یہ زندگی جس سے۔رہائی مل تو جاتی ہے سزا پوری نہیں ہوتی
حصۂ درد وراثت سے زیادہ ہی ملا۔مجھ کو شاید مری قسمت سے زیادہ ہی ملا
لوگ دو گز کے مکانوں میں بھی رہتے ہیں جہاں۔کوئی دروازہ' نہ آنگن' نہ دریچہ کوئی
غموں کی قید بھی کتنی عجیب ہے جس سے۔فرار ہوتے ہیں قیدی بری نہیں ہوتے
بزرگوں کی کبھی خدمت نہ کر پایے تھے آزر۔سو اپنے آپ کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں
اہلِ صحرا بھی بڑھے آتے ہیں شہروں کی طرف۔سانس لینے کو جہاں صرف دھواں باقی ہے
کسی بھی قصے کا کردار وہ نہیں تھا مگر۔بغیر اس کے ہر اک داستاں ادھوری تھی
ضمیر کہتا ہے ایمان ہے تو سب کچھ ہے۔زمانہ کہتا ہے پیسہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
جی زرق برق کپڑوں سے اس کا اچٹ گیا۔آنکھوں میں بس گئی تھی کفن کی جمالیات
راکشش کی جان طوطے میں تھی اور ہم جیسے لوگ
دم بہ دم اگ آنے والا در قلم کرتے رہے
مجموعی طور پر یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فریاد آزر کی شاعری

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

فریاد آزر کی غزلوں میں تخلیقی توانائی

روشن امکانات کی حامل ہے۔ وہ زرخیز تخلیقی ذہن رکھتے ہیں۔ ان کے تخلیقی عمل میں ہم عصر زمانہ کی نمائندگی اور ترجمانی ہے۔ وہ عصری مسائل کا عرفان رکھتے ہیں اور انسانی نفسیات واحساسات پر گہری نظر، جوان کی شاعری کو مقصدیت عطا کرتی ہے۔ فریاد آزر نہایت لگن، توجہ اور دل جمعی کے ساتھ شعری ریاضت میں مصروف ہیں۔☆☆☆

انسان کی تخلیقات خواہ عمارت ہو یا فنونِ لطیفہ کے شاہکار یا مختلف اوزار یا مشین، سب مادی کلچر کا جز ہیں۔ کسی قوم یا طبقہ کی بنائی ہوئی چیزوں پر نظر ڈالنے سے ہم اس قوم یا طبقے کے بارے میں بہت کچھ جان سکتے ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا ایک خاص کام یہ ہے کہ وہ مادی Relies کی دریافتوں کی بنا پر ناپید سماج کے اطوارِ حیات کو از سرِ نو شکل دیں۔ کرداری عمل کچھ ایسے اثرات ونتائج پیدا کرسکتا ہے جو ذہنی رویوں یا عقیدوں کی شکل میں زندہ رہتے ہیں اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے ہیں۔ گو اس عمل کے دوران وہ تغیر کی زد سے محفوظ نہیں ہوتے۔ یوں کسی سماج کے مقاصد واقدار بھی اس کے کلچر کا جزو قرار پاتے ہیں۔ اس میں کھیل کود کا شوق، جانوروں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ، مذہبی عقائد اور مذہبی عقائد اور ادب کی تخلیق بھی شامل ہے۔

ادب کی تخلیق میں شاعری خصوصاً غزل کا اکتساب عمل میں آتا ہے۔ ہمارے چاروں طرف جو کچھ چیزیں بکھری ہوئی ہیں وہ محض فریبِ نظر ہیں یا یہ زندگی جو ہمارے اندر ہے وہی ان چیزوں میں بھی ہے اور آگہی دراصل مماثلت پہچاننے کا نام ہے۔ جب ہم اپنی ذات سے باہر کی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا ہی ہے جیسے ہم اندر کی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ فن کار اس چیز کی نقل کرتا ہے جو کسی شے کے اندر ہے اور جو پیکر اور موسم کے ذریعہ فعال ہوتی ہے اور علامتوں، تشبیہوں سے گفتگو کرتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس صورت میں فن پارہ تخلیق کرنے کی امید میں ہے جو معروضی طور پر صحیح معنوں میں فطری ہے اور تاثرات کے لحاظ سے انسانی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اظہار کے بغیر اصل کی حقیقت انکشافی نہیں ہوتی اور پرجوش اظہار شاعری سے ہی ممکن ہے۔

فریاد آزر بھی شاعر ہیں اور بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کی غزلیں نفسِ مضمون کے اعتبار سے اعلا درجہ کی صداقت اور سنجیدگی کی خصوصیات رکھتی ہیں۔ فریاد آزر کا رویہ زندگی پر ان کی تنقید، وسعتِ نظر، آزادخیالی، فراخ دلی، ہوش مندی اور اعلا سنجیدگی ان کے تصوراتِ حیات میں موجود ہیں:

لمحہ لمحہ سلگتی ہوئی زندگی کی مسلسل قیامت میں ہیں !
ہم ازل سے چمکتی ہوئی خواہشوں کی طلسمی حراست میں ہیں

اس کے کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ زندگی آخرت کا عکس ہے۔ اب ہمیں سوچنا ہے کہ ہم لوگ دوزخ میں ہیں یا کہ جنت میں ہیں۔

ننھے بچپن میں بزرگوں سا تھا جس کا رکھ رکھاؤ۔ زندگی کی دوڑ میں وہ آدمی بچہ لگا
بدلے میں اُس کی موت مرا ہیں تمام عمر۔ وہ شخص جی گیا مرے حصے کی زندگی
وہ آدمی جوان رہے گا تمام عمر۔ بچپن میں جی چکا ہے جو بوڑھے کی زندگی

فریاد آزر کی غزلوں میں امکانی بیداری اور شعوری جدوجہد سے آگاہی ملتی ہے۔ ان کے تصورات کی وسعت اور احساس کی بے پناہ شدت میں ان کا فن مضمر ہے:

منتظر ہے وہ لمحہ ہمارا، ہمارے سب اعمال نامے لیے
اور ہم بسترِ زندگی پر بڑے ناز سے خوابِ غفلت میں ہیں
یاس، محرومی، محبت، کرب، خوش فہمی، انا۔ اتنے ساماں تھے، مرا تنہا مکاں چھوٹا لگا
نئی رُتوں نے ہوا کی رَو سے نہ جانے کیا ساز باز کرلی
کہ سبز صدیوں سے گونجتی آرہی ندائے اذان بھی چپ
یم بہ یم صحرا بہ صحرا نقشِ جاں جلتا ہوا۔ آتشِ نمرود میں سارا جہاں جلتا ہوا
جسم سے باہر سنہرے موسموں کا سبز لمس۔ روح کی تہ میں کوئی آتش فشاں جلتا ہوا
پرندے لوہے کے کنکر بموں کے پھینکتے ہیں۔ عذاب ہم پہ ہے کیوں ابرہہ کے لہجے میں

فریاد آزر روشن ذہن اور دردمند دل رکھتے ہیں وہ اپنی غزلوں میں تنگ نظری، تعصب، رجعت پسندی، مصلحت کوشی اور مفاد پرستی سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ انھوں نے آئینہ خانے سجائے ہیں اور سنگ خاروں کو اچھالا ہے۔ روایتی اصولوں کی زنجیریں انھیں مقید نہیں کرتیں اور خیال کی رو سے وہ ایک نئی دنیا تعمیر کرتے ہیں جس میں لفظیات ان کے اپنے ہیں اور کہنے کا لہجہ ان کا اپنا ہے۔ فکر فن کے ادراک و آگہی کی رچی بسی کیفیت دیکھئے:

جو مکاں اپنے بزرگوں نے بنایا تھا کبھی — اس مکاں میں ہم کرائے دار ہو کر رہ گئے

سب میں کرایےداروں کے پایے گیےنشاں۔جسموں کے شہر میں کوئی خالی مکاں نہ تھا

صبح ہوتی ہےتو دفتر میں بدل جاتا ہے۔یہ مکاں رات کو پھر گھر میں بدل جاتا ہے

زہر کارنگ اس کے بھی ہوجاتا حیرت سے سفید۔گر کبھی نیلا سراپا میرا' شنکر دیکھتا

میں اپنی قبر میں محوِ عذاب تھا لیکن۔زمانہ خوش ہوا دیوار پر سجا کے مجھے

فریاد آزر کا تجربہ غزل کے سانچے میں ڈھلتا ہےاور احساس کی شدت کا اظہار قدم قدم پر نمایاں ہوتا ہے۔ان کی غزلیں داخلی دروں بینی اور خارجی مسائل کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرتی ہیں۔سحر انگیزی، رعنائی و زیبائی،سوچ کی وسعت اور ذخیرہءالفاظ کی افضلیت فریاد آزر کو اپنے ہم عصروں میں نمایاں کرتی ہیں۔متحرک اور فعال پیکر اور واقعے کی آشنائی،معنی خیزی اور شناسائی ان کی غزلوں میں جیتی جاگتی نظر آتی ہیں:

جانے کس سمت سے آئی تھی ہوائے سازش۔آگ میں وادیِ کشمیر نظر آنے لگی

اب کے برس بھی جھوٹ ہمارا پیٹ بھرے گا۔سچائی افلاس لکھے گی اب کے برس بھی

کیا المیہ ہے سنہرے موسموں کے کارواں کا۔سب سفر میں ہیں' کسی کا ہمسفر کوئی نہیں ہے

سبھی کو زہر اپنے اپنے حصے کا پڑا پینا۔نئی تہذیب نے شاید کوئی شنکر نہیں پایا

یہاں فرار کی راہیں تو ہیں مگر مسدود۔کہاں کو جائے کوئی کائنات سے بچ کر

میں اپنی لاش کو تنہا ہی دفن کرلوں گا۔کہ تم بھی جاؤ سبھی لوگ گھر گئے اپنے

اب مناظر جنگلوں کے بھی ڈسیلے ہو گئے۔مبتلا جدت پرستی میں قبیلے ہو گئے

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں۔خوبصورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

ہم اپنے بچوں کو اردو سے رکھ کے ناواقف۔مٹا رہے ہیں سنہری زبان قسطوں میں

یہ کیا ہوا کہ بڑھاپا اچانک آ پہنچا۔ہم ایسے لوگ ہوئے تھے جوان قسطوں میں

آج کے مشینی دور میں طاقت آزمائی اور نئے اقتصادی نظام کی ہلچل نے فرد کی ذات کو پارہ پارہ کردیا ہے اور وہ اس شور و شغب سے بھرپور دنیا میں خود کو تنہا محسوس کررہا ہے۔تنہائی کے کرب نے اسے بے چین اور بے زار کردیا ہے، اسی لئے درد کی چیخ پرسکون فضا میں ارتعاش پیدا کررہی ہے۔فریاد آزر زندگی کا محور تلاشتے ہیں اور زائیدہ جہت کے معانی کے ابعاد کو اجاگر کرتے ہیں۔ان انگنت رنگ کی مصوری اس طرح سامنے آتی ہے:

میں اپنی روح لیے دربدر بھٹکتا رہا۔بدن سے دور مکمل وجود تھا میرا

جی رہا ہے وعدۂ فردا پہ تیرے اے خدا۔ورنہ اس بندے کو تیرا یہ جہاں چھوٹا لگا

نہ جانے کن خواہشوں کی شدت کا شور کمرے میں گونجتا تھا

نہ جانے کیا کہہ گئی ہوا' ہوگیا وہ خالی مکان بھی چپ

چہرے سبھی کے لگتے تھے مہمان سے مگر۔خود کے سوا کسی کا کوئی میزباں نہ تھا

کس کی خاطر اوڑھ رکھی ہے ردائے انتظاراں۔اس نئی رُت میں کسی کا منتظر کوئی نہیں ہے

بہت اکتا کے آیا تھا وہ خالی پن سے اندر کے۔جو دیکھا غور سے اس نے تو کچھ باہر نہیں پایا

صنعتی ترقی نے فضا کو ہی دھوئیں سے بھر دیا ہے بلکہ خود انسانی روح بھی اس عفریت سے متاثر ہوئی ہے اور برابر ہو رہی ہے۔انسانی زندگی اور جذبات سے بھرے پرے دل پر کالے دھوئیں کی موٹی تہیں چڑھی ہوئی ہیں جن کو کھرچنے کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔جب تک ایک تہہ کو کھرچیں اس کے اوپر کئی اور پرتیں جم جاتی ہیں۔فریاد آزر اس سچائی سے کماحقہٗ واقف ہیں،اسی لئے واضح اسلوب میں عصری حسیت کو برتتے ہیں اور شاعرانہ حسن کے ساتھ اپنے درد کے مرقعوں میں خونِ جگر سے رنگ بھرتے ہیں اور زندگی کی نیرنگی اور کلفت کا احساس دلاتے ہیں:

ادا ہوا نہ قرض اور وجود ختم ہو گیا۔میں زندگی کا دیتے دیتے سود ختم ہو گیا

نہ کوئی دوست' نہ ساتھی نہ کوئی رشتہ دار۔غریب کیا ہوئے سب لوگ مر گئے اپنے

تیری سیرت پسند تھی ورنہ۔تیری صورت کی لڑکیاں تھیں بہت

دفن کردیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہدِ قدیم۔رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید

پھر وہی منظر نظر کے سامنے کیوں آ گیا۔کربلا،خوں ریزی،کوفہ،تشنگی،صحرا،فرات

فریاد آزر نے لفظیات سے معنی کے نئے اسرار کھولے ہیں اور تکمیلِ احساس وجذبات کو نیا روپ دیا ہے۔وہ اساطیر سے بھی کام لیتے ہیں اور عالمی سطح پر ہونے والی افادیت پرستی زور زبردستی بلکہ دادا گری کو بھی اجاگر کرتے ہیں کہ اکتشافاتِ حاضرہ نے عمل وخیال کی ڈکشنری ہی بدل دی ہے۔بڑی طاقت یا پاور ہاؤس اور اس کی پشت پر سوار مطلب پرست ممالک کی نگاہ اسلامی ممالک اور وہاں کے تیل پر ہے جس کے حصول کے لئے وقت کو بے حس بنا دیا گیا ہے۔اس طرح آتشِ دل اور شرارِ ادراک کو دو آتشہ نہیں بلکہ تہس نہس کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔عالمی دہشت گردی کا چہرہ سفاک ہے جس کے بارے میں جان کر فریاد آزر یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

صحرا سے العطش کی صدا آرہی ہے پھر۔تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے پھر

شہر تھا شہروں میں اک،بغداد کہتے تھے جسے۔اور دریاؤں میں آزر ایک تھا دریا فرات

ہر آن سازشِ نو میں پھنسانا چاہتا ہے۔میں سر اٹھا ہی نہ پاؤں زمانا چاہتا ہے

اس نے میرا نام شوریدہ سروں میں لکھ دیا۔اور خود کو امن کے پیغمبروں میں لکھ دیا

کربلا ہو کہ فلسطین کہ ہو بوسنیا !۔درد صدیوں سے مرا نام ونسب جانتا ہے

وہ یہاں ندیاں بہا سکتا ہے لیکن خوں کی۔اُس کو ہر رنگ میں صحرائے عرب جانتا ہے

دہشت گردی اور فرقہ وارانہ فساد کا ننگا ناچ ہندستان میں بھی ہوتا رہا ہے۔بھاگل پور کا جب فساد ہوا تو ایک سو تین گاؤں میں یہ فساد پھیلا۔نتیجے میں بڑے پیمانہ پر مارکاٹ کا سلسلہ چلا۔ایک سو نو لاشوں کو کھیتوں میں گاڑ کر گیہوں کی فصل اگا دی گئی تھی۔لوگائی گاؤں کے اس انسانیت سوز بربریت پر بہت لکھا گیا۔ فریاد آزر کا درج ذیل شعر شاید اسی خونی واقعہ سے جڑا ہوا ہے۔

جہاں فساد میں اعضائے جسم کٹ کے گرے۔اسی زمین سے ہم لخت لخت اگنے لگے

محبت اور رفاقت کو تہہ تیغ کر کے سوندھی مٹی کی سرزمین گجرات میں جیسا فرقہ وارانہ فساد ہوا اسے دیکھنے اور بھوگنے والوں کی کیفیت دیکھئے:

فضائے آتشِ گجرات سے جو بچ نکلے۔ پرندے پھر نہ گئے لوٹ کر جہنم میں

ایسا خون آلود کھیل سیاست داں اپنے فائدے کے لئے کھیلتے ہیں اور سیاسی پارٹیاں یہ ناچ نچواتی ہیں۔فریاد آزر بلاجھجھک کہتے ہیں:

سروں کی فصل کٹتے دیکھنا اس کی سیاست ہے۔ ہے اس کا مشغلہ صحنِ فضا میں زہر بونے کا

فریاد آزر بیکری میں زندہ جلانے کو بھی یاد کرتے ہیں لیکن خوف اور بے بسی میں جینے والوں کی کیفیت بھی بیان کرتے ہیں:

اچھا ہوا کہ لوگ بیاں سے مکر گئے۔ بھن جاتے ورنہ وہ بھی کسی بیکری کے ساتھ

لیکن فریاد آزر نا امید نہیں ہیں۔ باطن کے پر اسرار نہاں خانے کی گتھیوں کو تعمیم و تاثیر کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کا تخلیقی شعور آگاہی لئے ہوئے ہے جو تطہیر کے مرحلے سے گزر کر شعری پیکر میں ڈھلتا ہے:

ظلم سے یکسر زمیں کو پاک ہونا چاہئے۔ظالموں کو اب سپرد خاک ہونا چاہئے

اس نے بھی نہریں بہائی ہیں ابلتے خون کی۔خاتمہ اس کا بھی عبرت ناک ہونا چاہئے

فریاد آزر مسلم قوم کی بے بضاعتی اور بے بسی کو بے حسی مانتے ہیں کہ ذات کے عرفان کے بغیر سماجی حقیقت کے راز وہ نہیں پا سکتے۔ وہ اخلاقی ابتری کے شکار ہیں اور چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔خلاقانہ تصرف کے لئے فریاد آزر سیاق وسباق کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہیں لوگ اپنے اپنے ہی خیموں کی فکر میں۔اور سازشوں میں قوم بٹی جا رہی ہے پھر

جدا جدا رگِ ظالم پہ وار کرتے ہیں۔ستم زدہ کبھی وحدت میں کیوں نہیں آتے

آج اپنی حیثیت کا جائزہ لیتے نہیں۔عظمتِ رفتہ کا بس ہم کو فسانہ یاد ہے

شاہی محلوں سے مٹا کر مجھ کو بے حس وقت نے۔جا بہ جا سہمے، شکستہ مقبروں میں لکھ دیا

آج اکیسویں صدی میں مخصوص ذہنیت پوری دنیا کی نصابی کتابوں میں اور تاریخی کتابوں میں بھی اسلام کے ابواب حذف کرنے،اس میں تصرف کرنے اور زہر آلود مواد بھرنے میں لگی ہوئی ہے۔فرضی کہانیوں یا فرضی واقعے کو تاریخی حقائق کے نام پر پیش کر کے سماج کو ایک مخصوص ڈگر پر ڈالنے کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ایک مخصوص ذہنیت کے لوگ اقلیتوں کے خلاف نفرت و ناراضگی کا بھرم پیدا کر کے معاشرے کے ساتھ نا انصافی اور زیادتی کر رہے ہیں۔فریاد آزر نے فکری وابستگی کے ساتھ احتجاج کیا ہے:

بچوں پہ ایسا جادو چلا ہے نصاب کا۔اکبر کا نام لینے لگے غزنوی کے ساتھ

آج مسلمانوں کو ہر طرح بدنام کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔کوئی بھی حادثہ ہوتا ہے مسلمانوں کو اشتہاری مجرم بنایا جاتا ہے،انھیں جیلوں میں بھر دیا جاتا ہے اور طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں،غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے،اشتعال انگیزی کی جاتی ہے،غیظ و غضب کا اظہار کیا جاتا ہے اور مبالغہ آرائی کو ہوا دے کر زہر اگلنے کا کرتب دکھایا جاتا ہے۔فریاد آزر آفاقی شعور رکھتے ہیں،ژرف نگاہی سے کام لیتے ہیں،سچائی کی بصیرت سامنے لاتے ہیں،استعماری نظام کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں اور معاشرہ کی متضاد گمراہی کو اجاگر کرتے ہیں۔اسی لئے لگتا ہے کہ ہم تاریخ کش اور ضمیر کش عہد میں جی رہے ہیں:

وہ جرم میں نے جسے ایک بار بھی نہ کیا۔ اسے قبول مجھے بار بار کرنا پڑا

بھر رہا تھا زہر وہ معصوم ذہنوں میں مگر۔ہم پہ نفرت گھولنے کا جرم عائد ہو گیا

ہندو کوئی تو کوئی مسلمان بن گیا۔انسانیت بھی مذہبی خانوں میں بٹ گئی

کہیں بھی قتل ہو کیسی عجیب سازش ہے۔لہو میں ڈوبی ہوئی میری آستین لگے

جہاں کہیں بھی میں طاقت کی شکل میں ابھروں۔کسی بہانے وہ مجھ کو دبانا چاہتا ہے

مرے وجود سے اس درجہ خوف ہے اس کو۔کہ میرا نام و نشاں ہی مٹانا چاہتا ہے

فریاد آزر کا وژن کرب و اذیت سے بھرا ہوا ہے۔معاصر عہد کے انسان کی بے جہتی اور بے راہ روی ساتھ ہی انتشار اور ابتری کا اظہار وہ مخصوص پیرائے میں کرتے ہیں،ان کا لہجہ،ان کا اسلوب بے حد واضح ہے۔استعاروں کی پیچیدگی بالکل نہیں ہے البتہ لسانی بست و کشاد میں اشارے ضرور ہیں۔انھوں نے لفظیات کو کثیر الجہت بنایا ہے اور برتتے وقت اس کا خیال رکھا ہے کہ تنوع برقرار رہے۔لطیف جذبات کے اظہار میں وہ منفرد پہچان رکھتے ہیں اور لب و لہجہ کے اچھوتے پن کی وجہ سے اپنے ہم عصروں میں الگ شخصیت کے مالک ہیں۔زبان پر گہری دسترس کی وجہ سے الفاظ کو نت نئے انداز میں بھی استعمال کرتے ہیں جس سے مفاہیم کی نئی دنیا آباد ہوتی ہے۔فریاد آزر نفسیات کے بھی ماہر ہیں۔وہ شاعرانہ حسن اور صناعانہ کمال کے ساتھ انسانی فطرت کی گہری واقفیت کو تاثیر کا پیکر بناتے ہیں اور سادہ پر سوز آہنگ کے ساتھ ساتھ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں:

میں اس کی باتوں میں غم اپنا بھول جاتا مگر۔وہ شخص رونے لگا خود ہنسا ہنسا کے مجھے

اسے یقین کہ میں جان دے نہ پاؤں گا۔ مجھے یہ خوف کہ روئے گا آزما کے مجھے

خامشی اس کی جان لیوا تھی۔اور باتوں میں تلخیاں تھیں بہت

فریاد آزر نے دنیائے کیف و رنگ کو تخلیقی توانائی عطا کی ہے۔وہ غزل کے مزاج کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اس شعور و احساس کو سلیقے سے برتنے کا ہنر جانتے ہیں۔ان کی غزلیں تازہ کار،نکتہ آفریں اور عصری حسیت سے بھرپور ہیں۔ وہ زمینی تجربہ کو جذب کر کے جاں گسل بناتے ہیں اور سوز کے ساتھ ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ان کے حرکی پیکر حقیقی احساسات کے آئینہ دار ہیں۔☆☆☆

ڈاکٹر ممتاز الحق

جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سبز ساعتوں کا شاعر: فریاد آزر

سنہ ۸۰ کے آس پاس شعراء کی جو نئی نسل سامنے آئی وہ کئی لحاظ سے اپنے پیش رو شعراء سے مختلف تھی۔ تازہ دم، نئی فکر اور نئے اسالیب کی موجد، تازہ ہوا کے جھونکوں کی مانند! ان کا کمٹمنٹ نہ ترقی پسندی سے تھا نہ جدیدیت سے۔ ایک آزاد تخلیقی فضا کا احساس دلانے والے ان شعراء میں ایک اہم نام تھا فریاد آزر ! فریاد آزر ۱۹۵۶ میں بنارس میں پیدا ہوئے، انٹر میڈیئٹ کے بعد اعلا تعلیم کی غرض سے دہلی تشریف لائے۔ جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر عنوان چشتی کی شاگردی میں ۷۷-۱۹۷۶ میں غزلیہ شاعری کا آغاز کیا۔

۱۹۹۴ میں فریاد آزر کا پہلا شعری مجموعہ **خزاں میرا موسم** منظرِ عام پر آیا اور پھر ایک طویل وقفہ کے بعد سنہ ۲۰۰۵ میں دوسرا شعری مجموعہ **قسطوں میں گزرتی زندگی** شائع ہوا۔ اس طویل وقفہ کی وجہ ایسے مسلسل حادثات تھے جنھوں نے آزر کے حوصلے پست کر دیے اور ان کی ذاتی زندگی بھی ایک مسلسل بے سکونی، ایک کرب ناک اضطراب اور ایک خاموش قیامتِ صغرا بن کر رہ گئی۔ دونوں مجموعوں کا انتخاب کچھ دن گلوبل گاؤں میں ۲۰۱۰ شائع ہوا۔

خزاں میرا موسم اور **قسطوں میں گزرتی زندگی** دونوں مجموعوں کے نام شاعر کے فطری درد و غم، اضطراب اور محرومی کے غماز ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ کوئی بھی حساس فن کار ان سے بچ نہیں سکتا۔ زندگی کا عرفان انھیں جذبات و احساسات کا مرہونِ منت ہے۔ آزر کے یہاں ذاتی غموں اور ناکامیوں نے اس رنگ کو اور بھی گہرا کر دیا ہے۔۔۔۔

پڑا تھا لکھنا مجھے خود ہی مرثیہ اپنا۔ کہ اپنے بعد بھلا اور کون تھا اپنا

پاؤں کے نیچے سلگتی ریت، صدیوں کا سفر۔ اور سر پر بارِ سقفِ آسماں جلتا ہوا

یاس، محرومی، تذبذب، کرب، خوش فہمی، انا۔ اتنے ساماں تھے، مرا تنہا مکاں چھوٹا لگا

کربلا ہو کہ فلسطین کہ ہو بوسنیا۔ درد صدیوں سے مرا نام و نسب جانتا ہے

کربلا، فلسطین اور بوسنیا کی علامتیں بتاتی ہیں کہ شاعر کا غم محدود نوعیت کا نہیں ہے، یہ اسے ورثہ میں ملا ہے اور اس غم میں پوری ایک نسل اس کی شریک ہے۔ اسے صرف اس جرم کی سزا دی جارہی ہے کہ وہ حق کا طرفدار ہے اور اسکی وابستگی دینِ محمدی سے ہے۔ حیرت کی بات نہیں کہ آزر کی پسندیدہ علامتیں قرآن، رسول، اذان، نماز، سورہ رحمان، سورہ یاسین وغیرہ ہیں۔ سبز رنگ ان کے یہاں خداشناسی، خدا ترسی، پاکیزگی، اخوت و محبت اور حق گوئی و بے باکی کا استعارہ ہے۔ سبز رنگ کے مختلف شیڈس آزر کے تخلیقی تجربات کی رنگارنگی کا وافر ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان پرکشش تراکیب پر نظر ڈالیں: سبز صدی، سبز لمحات، سبز ہوا، سبز لمس، سبز سایے، سبز موسم، سبز رخت، سبز ہاتھ اور سبز گھاس! اور جب یہ ترکیبیں جزوِ شعر بنتی ہیں تو یہی سبز رنگ کئی دوسرے رنگوں کے پیکر تخلیق کرتا ہے اور شعر کی بلاغت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

نئی رتوں نے ہوا کی رو سے نہ جانے کیا ساز باز کر لی

کہ سبز صدیوں سے گونجتی آ رہی ندائے اذان بھی چپ

اس نے تو جڑ سے کاٹ ہی دی تھی روایتاً۔ یہ سبز گھاس ہے کہ اگی آ رہی ہے پھر

مغربی طاقتیں مشرق اور خاص طور پر اسلام کو ہمیشہ زیر کرنے اور اسے بدنام کرنے کی فکر میں رہی ہیں، ان کی سازشیں بے نقاب ہو چکی ہیں مگر مشرقی ممالک کبھی گلوبلائزیشن کے نام پر، کبھی تیل کی سیاست اور کبھی ایٹمی توانائی کے حربوں سے ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ آزر کی شاعری اس صورتِ حال کے خلاف شدید احتجاج درج کرتی ہی ہے۔

جہاں کہیں بھی میں طاقت کی شکل میں ابھروں۔ کسی بہانے وہ مجھ کو دبانا چاہتا ہے

سر پہ آ کر رک گیا ہے آفتابِ مغربی۔ پی نہ جائے وہ کہیں اب سارے کا سارا فرات

اس قبیلے کے لہو میں ذائقہ اتنا لگا۔ جس کو بھی دیکھا اسی کے خون کا پیاسا لگا

آزر کی شاعری میں اقلیتی نفسیات کا گہرا شعور نظر آتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں اقلیتوں کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے، ان کی حق تلفی کی جاتی ہے اور بعض مواقع پر انھیں دوئم درجہ کا شہری قرار دیا ہے۔ ہندستان میں بار بار فرقہ وارانہ فسادات کا برپا ہونا اس امتیاز کی بدترین شکل ہے۔

جو مکاں اپنے بزرگوں نے بنایا تھا کبھی۔ اس مکاں میں ہم کرایے دار ہو کر رہ گئے

ہر آن سازشِ نو میں پھنسانا چاہتا ہے۔ میں سر اٹھا ہی نہ پاؤں زمانہ چاہتا ہے

آزر کو اس بات کا احساس ہے کہ ساری دنیا میں ملتِ اسلامیہ خود انتشار کا شکار ہے۔ اس کی ناکامی کا خاص سبب یہی ہے۔ اس رویہ کے خلاف آزر کے یہاں شدید برہمی ملتی ہے۔

متحد ہو کر نہ سورج کی طرح چمکے تو پھر۔ رفتہ رفتہ جگنوؤں کے پر کتر جائے گی رات

(بقیہ صفحہ 32 پر)

سعید رحمانی

کٹک (اڑیسہ)

گلوبل گاؤں کا نمائندہ شاعر۔ڈاکٹر فریاد آزر

اس میں شک نہیں کہ نئے عہد نے ہم پر خوش حالی اور عیش و عشرت کے در وا کیے ہیں سائنس اور ٹکنولوجی نے مادی ترقیات کو تیز رفتاری عطا کی ہے۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے اس وسیع و عریض دنیا کو ایک گلوبل گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے مگر بایں ہمہ ان سائنسی دریافتوں اور فکری جدتوں نے مادی پیش رفت کے پہلو بہ پہلو روحانیت کو بھی مجروح کیا ہے۔اطمینان، قلبی سکون اور راحت جیسی بے بہا دولت آج قصۂ پارینہ نظر آتی ہے۔یہ سب اس لیے کہ اعلیٰ اقدار کی پامالی، تہذیب کی شکست و ریخت، خود غرضی اور منافقت جیسی علتیں ہمارے معاشرے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر رہی ہیں۔آج کا انسان کبھی ذات کے محفوظ جزیرے میں قید نظر آتا ہے تو کبھی اجتماعی انتشار کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں خود کو نامساعد حالات سے متصادم پاتا ہے۔

اس بحران میں سانس لینے والی نسل زندگی کے چوراہے پر کھڑی آگے کا راستہ متعین کرنے میں منہمک نظر آتی ہے۔اس نسل کے فنکاروں میں جنھوں نے گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی کے آس پاس اپنے تخلیقی وجود کا ثبوت دینا شروع کیا ان میں سے بیشتر کی شاعری اپنے عہد کا ایک ایسا آئینہ نظر آتی ہے جس میں عہد حاضر کے مختلف چہرے عکس ریز ہیں۔انھیں فنکاروں میں ڈاکٹر فریاد آزر ایک اہم نام ہے۔وہ خالصتاً غزل کے شاعر ہیں۔عصری شعور کی حامل ان کی غزلیں سماجی، معاشی اور نفسیاتی رویوں کے ہر رخ کی ترجمانی کے ساتھ بالخصوص امت مسلمہ کی حالتِ زار کا المناک پہلو پیش کرتی ہیں۔ان غزلوں سے ان کا فکری اخلاص مترشح ہے جن میں سماجی شعور اور اسلامی فکر کی ایسی فضا بندی ہوئی ہے جس سے ان کی غزل گوئی کے وسیع تر امکانات روشن نظر آتے ہیں۔

ان کا حقیقی نام سید فریاد علی ہے اور ادبی دنیا میں ڈاکٹر فریاد آزر کے نام سے معروف ہیں۔بنارس میں ان کی ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۵۶ء کو ہوئی۔انٹر میڈیٹ وہیں سے کیا اور اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دہلی آ گئے۔دہلی یونیورسٹی سے بی اے، جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے ایڈوانس ڈپلومہ ان ماس کمیونیکیشن میڈیا، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔سر دست دہلی میں قیام ہے جہاں وہ درس و تدریس کے معزز پیشہ سے وابستہ ہیں۔صحافت کا اچھا تجربہ بھی رکھتے ہیں۔ماہنامہ انٹرنیشنل اردو میڈیا کی ادارت سے تین سال تک وابستہ رہے۔فی الحال ماہنامہ ''عاکف کی محفل'' کے مدیر اعزازی ہیں اور ادب ڈاٹ کوم کے موڈریٹر کی حیثیت سے اپنا ایک ادبی ویب سائٹ بھی چلا رہے ہیں جس کے ہزاروں ممبر ساری دنیا میں موجود ہیں۔

انھیں یوں تو بچپن سے شاعری کا شوق رہا ہے مگر اس کا باقاعدہ آغاز ۱۹۷۸ء میں کیا۔پہلے ساجن پردیسی مرحوم سے اصلاحیں لیں اور آخر میں پروفیسر عنوان چشتی مرحوم کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا۔اب ماشاءاللہ وہ اس مقام پر ہیں کہ دوسرے ان سے کسب فیض کر رہے ہیں۔یوں تو طالب علمی کے دور سے ہی ان کی تخلیقات شاعر، شب خون، آہنگ، سب رنگ، ادب لطیف، افکار (پاکستان) جیسے مقتدر رسائل کی زینت بننے لگی تھیں مگر اب یہ حال ہے کہ بیشتر رسائل میں نظر آتے ہیں اور اپنی ایک منفرد شناخت بھی بنائی ہے تصنیفات میں بچوں کا مشاعرہ کے علاوہ دو (غزلیہ) شعری مجموعے 'خزاں میرا موسم' اور 'قسطوں میں گزرتی زندگی' منظر عام پر آ کر خراج تحسین وصول کر چکے ہیں اور ابھی ابھی ان کا تیسرا شعری مجموعہ کچھ دن گلوبل گاؤں میں منظرِ عام پر آیا ہے جو دراصل پہلے دو مجموعوں کا ایک جامع انتخاب ہے۔اس انتخابی مجموعہ کو پیش کرنے کا عمل اس نقطۂ نظر سے لائق تحسین ہے کہ ان کی نمائندہ تخلیقات یکجا نظر آئینگی۔جو لوگ تحقیقی امور سے جڑے ہیں وہ اگر آزر صاحب پر کچھ لکھنا چاہیں تو اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔آزر صاحب کی شاعری کے متعلق لب کشائی سے پہلے میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کا یہ قول پیش کرنا چاہوں گا۔''شاعر وہی اچھا ہے جو اپنی مہر بند شخصیت میں روزن بنا کر خود کو لامتناہیت کے لمس سے آشنا کرے''۔ڈاکٹر فریاد آزر کی غزلوں میں واحد متکلم اگر چہ اپنی ہی ذات کے خول میں نظر بند آتا ہے، بنظر غائر دیکھا جائے تو وہ اپنی ذات کے اندر محدود نہ رہ کر ہر دور کے معاشرے کا ایک ایسا نمائندہ فرد ہے جس کی نظیر مسائل کی دھوپ میں تپتے ہوئے ریگستانوں میں کھڑے اس شخص سے دی جا سکتی ہے جو ہمدردی اور خلوص کی چادر سے محروم ہے۔دونوں مجموعوں کے بیشتر اشعار سے یہ گمان ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فریاد آزر کی وسطی زندگی جہد مسلسل میں گزری ہے اور زندگی کی کڑی دھوپ کے صحرا میں مدتوں آبلہ پائی کے کرب سے دو چار رہے ہیں۔واللہ علم بالصواب۔ان کے کچھ اشعار میرے اس گمان کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔مثلاً

وہ لے رہا تھا مرا امتحان قسطوں میں۔خبر نہ تھی نکالے گا جان قسطوں میں

تمام عمر بھٹکتا رہا میں خانہ بدوش۔خرید بھی نہ سکا اک مکان قسطوں میں
تمام قرض ادا کر کے ساہوکاروں کا۔بچا ہی لوں گا بزرگوں کی آن قسطوں میں
جو مکاں اپنے بزرگوں نے بنایا تھا کبھی۔اس مکاں میں ہم کرایہ دار ہو کر رہ گئے
صبح ہوتی ہے تو دفتر میں بدل جاتا ہے۔یہ مکاں رات کو پھر گھر میں بدل جاتا ہے
سب میں کرایہ داروں کے پائے گئے نشاں۔جسموں کے شہر میں کوئی خالی مکاں نہ تھا

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ آزر صاحب کی زندگی میں جو کڑے لمحے آئے ہیں ان میں بے گھری کا کرب سب سے نمایاں ہے۔ بنارس سے دہلی ہجرت اور پھر دہلی میں مستقل قیام کے دوران ان کی ذاتی زندگی میں اچانک قیامتِ صغرا کی زبردست ہنگامہ آرائی بھی ان کی شاعری میں جا بجا محسوس کی جا سکتی ہے۔شخصیت اور شاعری کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ شاعر جو محسوس کرتا ہے یا اس کے اپنے جو مشاہدات و تجربات ہوتے ہیں انہیں اس طرح شعری لباس عطا کرتا ہے کہ فردیت اجتماعیت کا روپ دھار لیتی ہے۔ فریاد آزر چونکہ ایک حساس انسان ہیں اس لئے عصرِ حاضر کی قہر سامانیاں ان پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی شاعری انسانیت کو درپیش مسائل سے مکالمہ آرائی کرتی نظر آتی ہے۔ آج کی صارفیت اور عالم گیریت کی اندھی دوڑ میں جبکہ اخلاقی قدریں اور ترجیحات یکسر بدل چکی ہیں انسانیت کا قتلِ عام جاری ہے ایسے میں آزر صاحب نے اپنی شاعری سے نوکِ نشتر کا کام لینے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن میں عہدِ حاضر کا منظر نامہ قاری کو لمحۂ فکریہ عطا کرتا ہے۔

گھٹ کے مر گیا مرے اندر کا آدمی۔ پھر آ کے بس گیا کوئی پتھر کا آدمی
اب اس کی روح میں شیطان بس گیا آزر۔ وہ جسم گاؤں سے انسان لے کے آیا تھا
اب کے برس بھی جھوٹ ہمارا پیٹ بھرے گا۔سچائی افلاس لکھے گی اب کے برس بھی

آج کی مادہ پرست دنیا کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ رشتوں میں استواری نہیں رہی۔ اگر دنیا سکڑتی جا رہی ہے تو فرد سے فرد کی دوری بھی بڑھنے لگی ہے۔ اس فکری بعد اور ذہنی فاصلہ نے انسان کو اپنی ذات کے خول میں بند کر دیا ہے۔ تنہائی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ چنانچہ شناسا لوگ بھی نظر پھیر کر گزر جاتے ہیں۔ بے حسی ایسی کہ منھ اور کان رہتے ہوئے بھی انسان گونگا اور بہرا لگتا ہے اور تو اور شہر ایک ایسا طلسم خانہ بن چکا ہے جس کی حدود میں قدم رکھتے ہی لوگ پتھر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔۔۔

وقت کے ٹھکرائے کو گردانتا کوئی نہیں۔ جانتے ہیں سب مجھے پہچانتا کوئی نہیں
پہلے تو اس نے شہر کو بہرا سمجھ لیا۔ پھر یوں ہوا کہ خود کو ہی گونگا سمجھ لیا
اب تو ہر شہر ہے اک شہرِ طلسمی کہ جہاں۔ جو بھی جاتا ہے وہ پتھر میں بدل جاتا ہے

اب ذرا دنیا کی تیز رفتاری اور خاندان کے بکھراؤ کے ساتھ ساتھ جدید دور کے یہ کرشمے بھی دیکھیں کہ کمپیوٹر نے اب بچوں کی کتابوں کے بستہ کی شکل لے لی ہے۔ اوزون کے سوراخ سے در آنے والی بنفشی شعاعوں کا حملہ بھی ہونے لگا ہے جس سے عملِ تنفس کا متاثر ہونا یقینی ہے اور لمحوں میں صدیوں کا فاصلہ طے کرنا کوئی محیر العقول بات نہیں رہی۔

ننھا کمپیوٹر 'قلم' کاپی' کتابوں کی جگہ۔ اس قدر سوچا نہ تھا ہو جائیں گے بستے جدید
ورنہ ہم سانس لینے کو ترس جائیں گے۔ سطحِ اوزون کو فضلات سے آزادی دے
چلنے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا۔ رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر فریاد آزر کی شاعری کا کینوس بے حد وسیع ہے جس میں جدید معاشرے کے جملہ مسائل اپنی تمام تر سنگینیوں کے ساتھ واضح نظر آتے ہیں۔ تاہم ان کی شاعری کا ایک خوشگوار پہلو ایسا بھی ہے جو ان سب پر حاوی نظر آتا ہے اور وہ پہلو ہے ان کی اسلامی فکر جسے ان کی شاعری میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ عہدِ حاضر میں اسلام مخالف طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب آج عالم اسلام جس سنگین صورتحال سے دوچار ہے وہ ہر ذی فہم کیلئے کسی لمحۂ فکریہ سے کم نہیں۔ ایسے میں ایک قلم کار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے تلوار کا کام لے اور اسلام مخالف سازشوں کا پردہ چاک کرے۔ آزر صاحب نے اس فریضہ کو بحسن و خوبی نبھایا ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے انگنت شعر کہے ہیں۔ کہیں تلمیح سے کام لیا ہے تو کہیں ایمائیت سے اور کہیں کہیں برملا اظہار بھی ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف چند اشعار کا حوالہ پیش ہے۔

دہر میں زندہ ابھی نمرود کا ہمزاد ہے۔ امتحاں میں اب بھی ابراہیم کی اولاد ہے
کربلا ہو کہ 'فلسطین' کہ ہو بوسینیا۔ درد صدیوں سے مرا نام و نسب جانتا ہے
سب سنائی دیتا ہے آزر اذانوں کے سوا محوِ حیرت ہیں کہ ہم بھی ہو گئے کتنے جدید
صحرا سے العطش کی صدا آ رہی ہے پھر۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے پھر

آزر صاحب کی شاعری سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ مروجہ یکسانئ فکر کی عام روش سے ہٹ کر انہوں نے جو اشعار کہے ہیں ان میں مواد اور ہیئت کے درمیان فاصلہ کو جس کامیابی سے طے کیا ہے اس سے ان کی فنی اور فکری بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ لسانی اور اسلوبیاتی سطح پر بھی وہ راہِ اعتدال سے متجاوز نہیں ہوئے ہیں۔ مشکل تراکیب اور دور از کار استعارات سے عمداً گریز سے ابلاغ و ترسیل کا مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وہ محاسن ہیں جن کی بدولت ان کی شاعری قاری کے انجذاب توجہ کا باعث بنتی ہے۔ ان کے ہاں کچھ اشعار ایسے بھی مل جاتے ہیں جنہیں ان کا شناس نامہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً ان کا یہ اولین شعر دیکھیں۔

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں۔ خوب صورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

بیشتر اشعار میں ان کی ایسی سوچ بھی کارفرما ہے جس سے ان کے فکری ارتفاع اور تخلیقی جوہر کا پتہ چلتا ہے۔ خصوصاً لفظوں کو انہوں نے جو کثیر الجہتی عطا کی ہے اس کے سبب ان کی شاعرانہ آواز اپنے ہم عصروں میں دور سے پہچانی جا

ہم اپنی روح کو ناراض　　بدن کی جی حضوری کررہے ہیں

سکتی ہے۔اس قبیل
کے چنداشعار دیکھیں۔

ہم نے گزاردی جسے چھاؤں میں بیٹھ کر۔وہ زندگی تھی دھوپ سے لڑنے کی زندگی
چلے تو فاصلہ طے ہونہ پایا لمحوں کا۔رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں
بدلے میں اس کی موت مرا میں تمام عمر۔وہ شخص جی گیا مرے حصے کی زندگی
سب کی آنکھیں رکھی تھیں گروی میرے دشمن کے پاس
کون میرے گھر کی بربادی کا منظر دیکھتا

اس میں شک نہیں کہ آزر صاحب حرف کے مزاج داں ہیں اوران کا کلام صلابتِ فکری اور شعری بصیرت کا نمونہ۔اس کے ساتھ ساتھ جدید حسیت، سماجی شعور اور اسلامی افکار سے وابستگی کے سبب ان غزلوں میں جو دلکش فضا بندی ہوئی ہے وہ ان کی شعری جہات کے وسیع تر امکانات کا جواز فراہم کرتی ہے۔میں سمجھتا ہوں کے گلوبل گاؤں کی نمائندگی کرنے والے ڈاکٹر فریاد آزر نے وقت کے محضر نامہ پر اپنے فکروفن کے جو دستخط ثبت کئے ہیں ان کی شناخت لکیروں کے ازدحام میں بڑی آسانی سے کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

(سبز ساعتوں کا شاعر کا بقیہ)

حالانکہ آزر کی شاعری کا مرکزی خیال قومی اور بین اقوامی مظالم کے خلاف شدید احتجاج ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عہد کے دیگر مسائل کی طرف ان کی نگاہ نہیں جاتی۔سماجی، سائنسی، سیاسی، معاشی، تہذیبی، مذہبی، ادبی گویا کہ ہر طرح کے مسائل پر وہ بہت باریکی سے نگاہ ڈالتے ہیں۔مندرجہ ذیل قبیل کے بے شمار اشعار آزر کے کلام میں کثرت کے ساتھ ملتے ہیں۔

ہاتھ ملتی رہ گئیں سب خوب سیرت لڑکیاں۔خوب صورت لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے
دفن کردیتا تھا پیدا ہوتے عہدِ قدیم۔رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید
پھر نہیں خوف کوئی دانوں بڑے دیوں سے۔سبز گلفاموں کو گر تھوڑی سیاست آجائے
ورنہ ہم سانس بھی لینے کو ترس جائیں گے۔سطحِ اوزون کو فضلات سے آزادی دے
گرو کی یاد انگوٹھے سے آنے لگتی ہے۔میں جب بھی ہاتھ میں تیر وکمان لیتا ہوں
زہر پینا ہی پڑے گا ہمیں اپنا اپنا۔اب کوئی دوسرا شنکر نہیں آنے والا

اظہار کی سطح پر آزر نے نئی شعری روایات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔غیر آرائشی زبان، سامنے کی مگر تازہ علامتوں کا استعمال، فارسی اضافتوں سے کم سے کم کام لینے کا ہنر، صنعتِ تضاد کے ذریعہ بیان کو پرتاثیر بنانے کا ملکہ، جذبہ وفکر کی ہم آہنگی، قافیہ وردیف کی بنیاد پر شعر کو استوار کرنے میں مہارت ایسی خصوصیات ہیں جن سے آزر کے شعری مزاج اور انفرادیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ترکیب سازی میں بھی آزر کے یہاں جدت نمایاں ہے۔جسم کی کشتی، خواہشوں کا بحرِ بیکراں، سکوت موسم مکان، نیلا سراپا، تاریخی مسجدوں کا سکوت، برہنہ طرزِ بیان، سیاہ لفظوں بھری داستان، مٹی کا بادشاہ، دھوئیں کا لشکر، کربِ فلسطین وغیرہ۔اس طرح ان تراکیب کی مدد سے وہ نئی شعری زبان کو نئے جہات سے آشنا کرنے میں بھی بڑی جدت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔مثلاً غارِ حرا کے لہجے میں پناہ دینا، ابرہہ کے لہجہ میں عذاب کا آنا، خوش فہمی کے پنجوں پر کھڑے ہونا، قربتوں کی زد میں آنا، قسطوں میں جوان ہونا، قسطوں میں جینا مرنا وغیرہ۔آزر کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے ان کا شعری مواد کبھی گھسا پٹا نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ کہ آزر نے زندگی اور دنیا کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، کائنات کے ذرہ ذرہ کو بغور محسوس کیا ہے۔اس کے علاوہ تخیل کی پرواز بھی آزر کو دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔بڑے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ دنیائے غزل میں فریاد آزر کا نام مستقبل قریب میں سورج کی طرح نمایاں ہوگا کیوں کہ آزر نے غزل میں اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت کیے ہیں۔

☆☆☆

نچایا ہے رعایا کو ہمیشہ اپنی انگلی پر   سو اب ظلِ الٰہی برسرِ بازار ناچیں گے

ڈاکٹر فریاد آزر کی شعری کائنات

وقت کے ٹھکرائے کو گردانتا کوئی نہیں
جانتے ہیں سب مجھے، پہچانتا کوئی نہیں
جب سے میں نے گفتگو میں جھوٹ شامل کرلیا
میری باتوں کا برا پھر مانتا کوئی نہیں
آج کل ہر خواب کی تعبیر ممکن ہے مگر
یہ سنہرا عزم دل میں ٹھانتا کوئی نہیں
کچھ تو ہوگا حال سے ماضی میں ہجرت کا سبب
یوں ہی بس یادوں کی چادر تانتا کوئی نہیں
اپنے اپنے زعم میں ہے مبتلا ہر آدمی
ایک دوجے کو یہاں گردانتا کوئی نہیں
میں نے جو کچھ بھی کہا، سچ کے سوا کچھ بھی نہ تھا
پھر بھی آزرؔ بات میری مانتا کوئی نہیں

وہ لے رہا تھا مرا امتحان قسطوں میں
خبر نہ تھی کہ نکالے گا جان قسطوں میں
تمام عمر بھٹکتا رہا میں خانہ بدوش
خرید بھی نہ سکا اک مکان قسطوں میں
تمام قرض ادا کر کے 'ساہوکاروں' کا
بچا ہی لوں گا بزرگوں کی آن قسطوں میں
ہم ایک ساتھ نہیں کرتے گھر کی آرائش
ہم ایسے لوگ بڑھاتے ہیں شان قسطوں میں
بسا رہا ہے ہر اک فرد اک الگ ہی جہاں
بکھر رہا ہے ہر اک خاندان قسطوں میں
ہم اپنے بچوں کو اردو سے رکھ کے ناواقف
مٹا رہے ہیں سنہری زبان قسطوں میں
اگر ہماری یہی بے حسی رہی آزرؔ
مٹا ہی دے گا وہ نام و نشان قسطوں میں

حصہء درد وراثت سے زیادہ ہی ملا
یعنی مجھ کو مری قسمت سے زیادہ ہی ملا
غم زمانے کا ذرا سا ہی خریدا تھا مگر
مال مجھ کو مری قیمت سے زیادہ ہی ملا
وہ سیاست نے دیے ہوں کہ محبت نے تری
زخم اس دل کو ضرورت سے زیادہ ہی ملا
لوگ جنت کے طلب گار ہیں لیکن اے ماں
تیری آغوش میں جنت سے زیادہ ہی ملا
لاکھ تدبیر نے خوشیوں کو منایا لیکن
رنج تقدیر کو راحت سے زیادہ ہی ملا
ہم جسے یوں ہی سدا چھوڑ دیا کرتے تھے
حاشیہ حسنِ عبارت سے زیادہ ہی ملا
میں حقیقت کا پرستار ہوں لیکن آزرؔ
خواب آنکھوں کو حقیقت سے زیادہ ہی ملا

خوبصورت سا بھرم توڑ گیا تھا کوئی
دور رہتی تھی کہیں چاند پہ بڑھیا کوئی
لوگ دو گز کے مکانوں میں بھی رہتے ہیں جہاں
کوئی دروازہ، نہ آنگن نہ دریچہ کوئی
وہ فراعین ہیں کہ روحِ زمیں کانپتی ہے
اور اس عہد میں آیا نہیں موسیٰ کوئی
آج سیرت نہیں، صورت کو نظر ڈھونڈتی ہے
عمر ڈھل جاتی ہے، آتا نہیں رشتہ کوئی
اب فرشتوں سے ملاقات کہاں ممکن ہے
کاش انساں ہی زمیں پر نظر آتا کوئی
عمرِ نو سے ہی مسائل مرے محبوب رہے
میرے خوابوں میں نہ رضیہ ہے نہ رادھا کوئی
جو نئی نسل کو آفات کا حل بتلاتا
کیا بچا ہی نہیں اس شہر میں بوڑھا کوئی

اس تماشے کا سبب ورنہ کہاں باقی ہے
اب بھی کچھ لوگ ہیں زندہ کہ جہاں باقی ہے
اہلِ صحرا بھی بڑھے آتے ہیں شہروں کی طرف
سانس لینے کو جہاں صرف دھواں باقی ہے
زندگی عمر کے اس موڑ پہ پہنچی ہے جہاں
سود ناپید ہے، احساسِ زیاں باقی ہے
ڈھونڈتی رہتی ہے ہر لمحہ نگاہِ دہشت
اور کس شہرِ محبت میں اماں باقی ہے
میں کبھی سود کا قائل بھی نہیں تھا لیکن
زندگی اور بتا کتنا زیاں باقی ہے
ایسی خوشیاں تو کتابوں میں ملیں گی شاید
ختم اب گھر کا تصور ہے، مکاں باقی ہے
لاکھ آزرؔ رہیں تجدیدِ غزل سے لپٹے
آج بھی میرؔ کا اندازِ بیاں باقی ہے

دل نے اچھائی' برائی کو بس اتنا سمجھا
یعنی گر خود کو برا سمجھا تو اچھا سمجھا
اب سمندر پہ وہ چلتا ہے تو حیرت کیسی
عمر بھر اس نے سرابوں کو ہی دریا سمجھا
اور چارہ بھی نہ تھا اس کے علاوہ کوئی
ہم نے ہر دور میں قاتل کو مسیحا سمجھا
مجھ کو سیلاب نے سمجھایا زمیں پیاسی تھی
زلزلہ آیا تو میں نے ترا غصہ سمجھا
مات دی میں نے جو شیطاں کو بھی عیاری میں
پھر مجھے سارے زمانے نے فرشتہ سمجھا
عمر بھر خامۂ تنقید نے مانا مردہ
بعد از مرگ مجھے اس نے بھی زندہ سمجھا
جب مرے خواب حقیقت میں نہ بدلے آزرؔ
میں نے دنیا کی حقیقت کو بھی سپنا سمجھا

عجیب طور کی مجھ کو سزا سنائی گئی　　بدن کے نیزے پہ سر رکھ دیا گیا میرا

ڈاکٹر فریاد آزر کی شعری کائنات

جہاں کے واسطے سامانِ عبرت کر رہے ہیں
ہم اپنے نفس کی ایسی اطاعت کر رہے ہیں
کسی کو ایک ہی سجدہ میں جنت مل گئی ہے
مگر کچھ لوگ صدیوں سے عبادت کر رہے ہیں
حقیقت اس قدر سنگین ہوتی جا رہی ہے
نگاہوں سے سنہرے خواب ہجرت کر رہے ہیں
نہیں مرغوب مردہ بھائیوں کا گوشت کھانا
تو ہم پھر کس لئے غیبت پہ غیبت کر رہے ہیں
بھروسا اٹھ گیا جنت سے کیا اہلِ زمیں کا
اسی دنیا میں ہی تعمیر جنت کر رہے ہیں
ہمارے صبر کا انداز بدلا جا رہا ہے
تو کیا ہم اپنے قاتل کی حمایت کر رہے ہیں
بزرگوں کی کبھی خدمت نہ کر پائے تھے آزرؔ
سو اپنے آپ کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں

نہ ہو گر خوفِ دوزخ اور نہ لالچ بھی ہو جنت کا
بھرم کھل جائے پھر ہم جیسے لوگوں کی عبادت کا
ملا تھا کل جسے رتبہ جہاں کی بادشاہت کا
تماشا بن چکا ہے آج وہ خود اپنی عبرت کا
خدا کو اتنے چہروں میں کیا تقسیم بندوں نے
نظر آتا نہیں اب کوئی بھی امکان وحدت کا
جہاں روحانیت اپنی حدوں کو ختم کرتی ہے
خلافت مل گئی تو پھر نہ پوچھا حال امت کا
تو پھر اقوام متحدہ میں بھی جمہوریت لائے
اگر سچ مچ ہی دشمن ہے وہ ظالم آمریت کا
عجب خود دار تھا کچھ مانگنے میں شرم آتی تھی
لہٰذا وہ چرا لاتا تھا ہر ساماں ضرورت کا
مرے اشعار بے معیار جیسے بھی ہیں اچھے ہیں
نہیں محتاج میں آزرؔ فصاحت کا، بلاغت کا

یوں مسائل نے مری زیست میں ہڑدنگ کیا
مینکا بن کے رشی دھیان مرا بھنگ کیا
کچھ تو اعمال بھی تھے اپنی تباہی کا سبب
اور کچھ وقت نے بھی ملکِ خدا تنگ کیا
کم نہیں ہے یہ سیاست کسی محبوبہ سے
دل کو ہر آن رلانے کا عجب ڈھنگ کیا
ذہن تو پہلے ہی قائل تھا سخن فہمی کا
اور دل نے بھی رخِ حضرتِ نارنگ کیا
صرف تقریر نہ تھی اس پہ دل آنے کا سبب
اس نے تحقیق کے میداں کو بھی گلرنگ کیا
مختلف مجھ سے سدا رہنے کی کوشش اس کی
زندگی کو بڑی مشکل سے ہم آہنگ کیا
دل تو میزانِ محبت پہ تھا بھاری لیکن
اس نے ہی ناز و ادا سے اسے پاسنگ کیا

آج کل جیسی تجارت پہ اتر آئے ہیں
اہلِ ایمان بھی دولت پہ اتر آئے ہیں
جو تھے مخصوص کبھی اور ہی قوموں کے لئے
کچھ عذاب ایسے بھی امت پہ اتر آئے ہیں
کیا بزرگوں میں بھی کچھ خامیاں پائی گئی ہیں؟
آج کیوں بچے نصیحت پہ اتر آئے ہیں؟
عرش کیوں ہلنے لگا ہے، کہیں ایسا تو نہیں!
کچھ گنہگار عبادت پہ اتر آئے ہیں
کیا مرا نامہ ء اعمال ہی کافی نہیں تھا؟
میرے اعضا بھی شکایت پہ اتر آئے ہیں
روکھی سوکھی پہ سدا شکر ادا کرتے تھے
اب تو ہم لوگ بھی لذت پہ اتر آئے ہیں
بے حسی دیکھ کے اب اپنوں کی اکثر شبِ غم
درد خود اپنی عیادت پہ اتر آئے ہیں

حدِ نظر تک اپنے سوا کچھ وہاں نہ تھا
میں وہ زمین جس کا کوئی آسماں نہ تھا
سب میں کرایے داروں کے پائے گئے نشاں
جسموں کے شہر میں کوئی خالی مکاں نہ تھا
بچپن کے ساتھ ہو گیے بوڑھے تمام ذہن
ہم مفلسوں کے گھر میں کوئی نوجواں نہ تھا
چہرے سبھی کے لگتے تھے مہمان سے مگر
خود کے سوا کسی کا کوئی میزباں نہ تھا
لذت نہ مل سکی مری تخئیل کو کبھی
ورنہ مرے گناہ کا موسم کہاں نہ تھا
ہر زاویے سے بول چکے تھے مرے بزرگ
باقی مرے لیے کوئی طرزِ بیاں نہ تھا
ان خواہشوں کی چھاؤں میں گزری تمام عمر
جن خواہشوں کے سر پہ کوئی سائباں نہ تھا

آزما کر عالمِ ابلیس کے حربے جدید
ہو گئے قابض مری صدیوں پہ کچھ لمحے جدید
دفن کر دیتا تھا پیدا ہوتے ہی عہدِ قدیم
رحم ہی میں مار دیتا ہے اسے دورِ جدید
ننھا کمپیوٹر ! قلم، کاپی، کتابوں کی جگہ
اِس قدر سوچا نہ تھا ہو جائیں گے بستے جدید
ہو گیا محروم بینائی سے بھی اب آخرش
دیکھتا تھا رات دن وہ آدمی سپنے جدید
کیوں نہیں لے جاتی اب وحشت بھی صحرا کی طرف
بن گیا کیوں شہر از خود آج صحرائے جدید
دادی اور نانی کے قصوں میں مزہ آتا نہیں
اب سناتے ہیں مرے بچے انھیں قصے جدید
سب سنائی دیتا ہے آزرؔ اذانوں کے سوا
محوِ حیرت ہیں کہ ہم بھی ہو گئے کتنے جدید

سید نفیس دسنوی

ڈاکٹر فریاد آزر کی غزلوں سے منتخب میرے پسندیدہ اشعار (فیس بک کے حوالے سے)

چلے تو فاصلہ طے ہو نہ پایا لمحوں کا ۔ رکے تو پاؤں سے آگے نکل گئیں صدیاں

☆

زمانہ آگے کی جانب رواں دواں تھا مگر ۔ وہ شخص پچھلے زمانے تلاش کرتا رہا

☆

تیسری بار بھی تو بول پڑا چپ نہ رہا ۔ راستہ آج مرا تجھ سے جدا ہوتا ہے

☆

کوئی بھی دنیا میں اس جیسا نہ تھا ۔ جسم کے جس کا کوئی سایہ نہ تھا

☆

کیا المیہ ہے سنہرے موسموں کے کارواں کا ۔ سب سفر میں ہیں، کسی کا ہم سفر کوئی نہیں

☆

کم نہیں ہے یہ سیاست کسی محبوبہ سے ۔ دل کو ہر آن رلانے کا عجب ڈھونگ کیا

☆

ہوا کے حکم کی تعمیل ہونے والی ہے ۔ گل احتجاج کی قندیل ہونے والی ہے

☆

عمر بھر تجربے کام آتے ہیں بیشک آزرؔ ۔ تجربوں ہی میں مگر عمر گزر جاتی ہے

☆

سب میں کرائے داروں کے پائے گئے نشاں ۔ جسموں کے شہر میں کوئی خالی مکاں نہ تھا

☆

ہم جسے ٹھیک سمجھتے ہیں اسے مانتے ہیں ۔ آپ بھی اپنے نظریات پہ قائم رہئے

☆

عجیب دھن تھی اسے قافیے بدلنے کی ۔ وہ آدمی بھی مزاجاً ردیف جیسا تھا

☆

سمجھ سکا نہ کبھی اس کی دشمنی آزرؔ ۔ وہ مار کر مجھے کچھ لمحہ واقعی رویا

☆

سماعتوں کے نقوش میں ڈھونڈتا رہا کب سے ۔ مجھے بھی سن لو کہ ناشنیدہ صدا ہوں کب سے

☆

کیا اسے علم کہ وہ مجھ کو صدا دیتا ہے ۔ وہ تو معصوم ہے جینے کی دعا دیتا ہے

☆

مجھے یقین ہے زندہ رہے گا آزرؔ بھی ۔ کوئی کسی کی محبت میں جان کیا دے گا

☆

سب اپنی اپنی منزلِ مقصود پا گئے ۔ کربِ انا لیے میں فقط سوچتا رہا

☆

اسے اب اتنی دزدیدہ نگاہی سے مت دیکھو
کہ وہ سب بھول کر تصویر سے باہر نکل آئے

☆

ہمیں دیا تھا یہ جمہوریت نے حق لیکن ۔ اس اختلاف کو اس نے مخالفت سمجھا

☆

وہ دور تھا تو کشش کھینچ لے گئی اس کی ۔ قریب پہنچا تو منظر بدل گیا کتنا

☆

جدید راہوں کی ایجاد اچھی لگتی ہے ۔ ہم ایسے لوگ کہاں قافلے میں رہتے ہیں

☆

احباب سن نہ پائے جو میرے قریب کے ۔ آواز میری وہ بھی بہت دور تک گئی

☆

اے وطن تیری محبت میں جو الزام لگے ۔ ہم انھیں پیار کا انعام سمجھ بیٹھے ہیں

☆

سونہ جایے کہیں دنیا کو جگاتے رہئے ۔ اپنے ہونے کا بھی احساس دلاتے رہئے

☆

ہمیشہ سر اٹھا کر بات کرتے ہیں جو جھوٹے ہیں ۔ بڑا وہ ہے جو سب سے سر جھکا کر بات کرتا ہے

☆

عورت کے اشکوں سے بھی جو نہ پگھلے وہ پتھر ۔ اور پگھل جائے تو وہ نادان بہت ہے

☆

تخیلات میں پھر تخت و تاج لگنے لگے ۔ زمیں ہٹی تو خلا میں درخت اگنے لگے

☆

یہاں فنکار کو پہچاننے والے بہت ہیں ۔ مگر شہرت پہ کم ظرفوں نے قبضہ کر رکھا ہے

☆

سب پہ تنقید کرنے والے لوگ ۔ اپنی اصلاح کیوں نہیں کرتے؟

☆☆☆

علیم صبا نویدی
Flat No-16,Second Floor .
Rice Mandi Street,Chennai -600005

فن وشخصیت

ظہیر غازی پوری کی رباعی گوئی

آمد 1938۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رخصت 3-11-2016

اردو شاعری میں غزل کو اردو کی آبرو قرار دیا گیا ہے۔اس صنف کی مقبولیت نے دوسری صنفوں کو اس سے آگے بڑھنے نہیں دیا ہے۔رباعیات کی صنف شاید غزل کی مقبولیت کے فوراً بعد آتی ہے۔اس صنف رباعی کو سبھوں نے مشکل صنف قرار دیا ہے'اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اس میں شاعر کو پہلے تو اظہار میں پختگی درکار ہے۔ذرا سی چوک ہو جانے پر رباعی نہیں رہتی بلکہ قطعہ بن جاتی ہے۔رباعی کہنے والے شعراء کی تعداد نسبتاً غزل سے بہت کم ہے۔رباعی چار مصرعوں پر مبنی صنف ہے جس میں تین مصرعوں کا وزن یکساں ہوتا ہے۔یعنی دو مصرعوں اور چوتھے مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں۔تیسرا مصرعہ بہت اہم ہوتا ہے جس میں تینوں مصرعوں کے وزن سے ذرا سا انحراف ہوتا ہے۔نیز شاعر آخری مصرع کے مضمون کو سہارا دے کر شعر کے مضمون کو پوری طرح ادا کر دیتا ہے۔گویا یہ کلائمکس کا کام کرتا ہے۔رباعی میں کبھی فلسفیانہ خیال کی ادائیگی ہوتی ہے یا پھر اخلاقیات پر مبنی مضمون لایا جاتا ہے۔خمریات پر مبنی مضامین کو بھی رباعیوں میں پیش کرنے کا رواج رہا ہے۔اس صنف میں احساس کے زیریں لہروں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔یہ بات قطعات میں بھی ممکن ہے مگر رباعی میں قدرتِ کلام اور فنی مہارت پر ہی دھیان دیا جاتا ہے۔شاعر کی عظمت کو رباعی کی صنف مستحکم کرتی ہے۔

ظہیر غازی پوری نے جہاں صنف غزل میں اپنی مشق سخن کی داد پائی ہے وہیں رباعیات میں بھی انھوں نے اپنے لئے ایک مستحسن مقام پیدا کر لیا ہے۔ اس صنف میں بھی انھوں نے غزل کی طرح اپنی جولانئ طبع کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔غزل کی ایمائیت ہی کی طرح ظہیر غازی پوری نے رباعی کی فکری توانائی کو بھی مزید توانا بنانے کی طرف ایک قدم آگے بڑھایا ہے۔انھوں نے اپنی رباعیات میں نہ جانے کتنے ہی اوراقِ خیالات کو اُلٹنے کی کوشش کی ہے۔ہر قسم کے مضمون کو برتا ہے۔ظہیر غازی پوری کی کرشمہ سازی عروج پر دکھلائی دیتی ہے۔ان کے اندر کا شاعر پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے۔یہ صنف بھی غزل کی طرح ظہیر سے احساس شگفتہ کا نمو مانگتی ہے۔ظہیر نے غزل کے بارے میں رباعی میں یوں بیان کیا ہے'یہ بات رباعی پر بھی صادق آتی ہے۔

تعریف نہ تحسین نہ غلو مانگتی ہے۔احساس شگفتہ کا نمو مانگتی ہے
ہم جس کو غزل کہتے ہیں وہ شاعر سے۔جب مانگتی ہے دل کا لہو مانگتی ہے

ظہیر غازی پوری کی تمام کی تمام رباعیات فکری کاوشوں سے بھرپور لگتی ہیں،کوئی رباعی کسی رباعی سے معیاراً کم نہیں ہے۔مضامین کی نت نئی کروٹیں بڑی دلآویز ہیں۔ان کی بعض رباعیات ملاحظہ فرمائیے۔جن میں جدتِ خیال بھی ہے اور وحدتِ بیان بھی۔

کیا چیز ہوا کرتے ہیں الفاظ کے گھر۔اس سمت بھی ارباب ادب ایک نظر
پتھر پہ یہاں پستی نہیں ہے مہندی۔مہندی پہ پیا کرتا ہے خود پتھر

☆

معقول کو مقبول بنا دیتے ہیں۔مقبول کو معمول بنا دیتے ہیں
ہم آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو کو بھی۔جب چاہتے ہیں پھول بنا دیتے ہیں

التجائی نوعیت کی رباعی کا انداز ملاحظہ کیجئے

غالب جو تھا مغلوب ہوا ہے یارب۔معصوم بھی مصلوب ہوا ہے یارب
یہ کیسی ہوا ہے کہ زمانے بھر میں۔بندہ ترا معیوب ہوا ہے یارب

حمدیہ رباعی کا ڈھنگ ملاحظہ کیجئے۔

کیسی ہے تری شان وکرامت اللہ۔مجھ سے نہ ہوئی اس کی صراحت اللہ
سو رنگ میں کرتے ہیں زمانے والے۔ہم ہر دم توصیف عبادت اللہ

نعتیہ رباعی ملاحظہ فرمائیے

اک نور کے مکتوب رسولِ اکرمؐ۔کونین میں خوب رسولِ اکرمؐ
ثانی نہیں نبیوں میں کوئی بھی ان کا۔خودرب کے ہیں محبوب رسولِ اکرمؐ

انسانی برتری پر ظہیر صاحب یوں کہتے ہیں

الطاف'عنایات' کرم باقی ہے۔ہر دعویٔ بے لوح وقلم باقی ہے
اپنی بھی تو قیر نہیں ہے کچھ کم۔ہم ہیں تو مشیت کا بھرم باقی ہے

تخلیقی کرب کا اظہار ملاحظہ فرمائیے

خوں باریٔ لمحات سے شرمندہ ہوں۔زخموں کے حسابات سے شرمندہ ہوں
تخلیق کا ہر کرب ہے نیزے کی انی۔میں فن کی عنایات سے شرمندہ ہوں

(بقیہ صفحہ 41 پر)

ڈاکٹر محمد چاند نظامی
ہزاری باغ (جھارکھنڈ)

ظہیر غازیپوری۔۔۔۔۔۔۔جنھیں برسوں زمانہ یاد کرے گا

میں وہ سورج ہوں نہ ڈوبے گی کبھی جس کی کرن
رات ہوگی تو ستاروں میں بکھر جاؤں گا!

رات گیارہ بجے تھے، موبائل کی گھنٹی بجی، پاؤں میں موچ کے سبب بستر سے اٹھنا مشکل تھا، بیگم نے بڑی بے پروائی سے موبائل تھماتے ہوئے کہا ظہیر چچا کا فون ہے، یہ سنتے ہی دھڑکن تیز ہوگئی اور جس انہونی کا اندیشہ مجھے پچھلے چار پانچ دنوں سے گھیرے ہوئے تھا، ذہن فوراً اسی کی طرف گیا، کیونکہ ظہیر صاحب رات دس بجے کے بعد کبھی فون پر زحمت نہیں دیتے تھے، اکثر صبح سویرے فون کرتے اور کہتے، بھائی رات میں ہی گفتگو کرنے کو جی چاہ رہا تھا، لیکن آپ لوگ نوجوان ہیں، سو چا سو نہیں گئے ہوں اور خواہ مخواہ میری سمع خراشی سے طبیعت مکدر نہ ہو جائے۔ چنانچہ کل رات برخلاف معمول موبائل آن کر کے بجائے سلام علیک کہنے کے، 'ہیلو' کہہ کر اپنی بیداری کا ثبوت دیا، فوراً دوسری جانب سے آواز آئی 'چاند انکل میں شکیب بول رہا ہوں، ابھی تھوڑی دیر پہلے دادا کا انتقال ہو گیا'۔ یہ سنتے ہی زبان گنگ ہوگئی اور یہ پوچھنے کی بھی زحمت نہ اٹھا سکا کہ کہاں انتقال ہوا، گھر میں یا ہسپتال میں۔ موبائل ہاتھ سے کھسک گیا اور دوسری طرف سے لائن disconnect ہوگئی۔

اب مجھے گزشتہ سنیچر کے اس سوال کا جواب مل گیا تھا، جو ظہیر صاحب کی ایک مختصر تحریر پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ میری فرمائش پر انہوں نے جو چند سطریں تحریر کی تھیں ان کے جملے اتنے بے ربط کیوں تھے؟ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے کاغذ کا ایک صفحہ دیتے ہوئے موصوف نے کیوں کہا تھا کہ بھائی سال ڈیڑھ سال بعد بس اتنا ہی لکھ سکا ہوں، اب نہ تو وجدان ساتھ دیتا ہے اور نہ تعقل، دیکھو شاید پسند آجائے ورنہ معاف کرنا۔

اس دوران میں نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ آج ظہیر صاحب کی گفتگو میں خشکی بہت ہے۔ ان کی ہر بات سے اظہار بیزاری کا صاف احساس ہوا اور میرے دل میں وہ بات گھر کر گئی جس کا اظہار میں کسی سے نہیں کر سکتا تھا، مگر من ہی من دعا کرتا رہا کہ خدا کرے ایسا نہ ہو جیسا مجھے محسوس ہو رہا ہے، لیکن ہوا وہی جو کاتب تقدیر کو منظور تھا، ظہیر صاحب رخصت ہو گئے! وہ اپنی الجھن، بیچارگی، تشنہ لبی اور مایوسی سے ہار پا گئے، جسے کبھی انہوں نے اپنی زندگی قرار دیا تھا ؎

الجھنیں، بیچارگی، تشنہ لبی، مایوسی + کیا بتاؤں اور کیا ہے میرے گھر کی زندگی

یوں تو ظہیر صاحب کا وطن یوپی کا ضلع غازیپور تھا، لیکن بغرض ملازمت وہ 1969ء میں ہزاری باغ آئے اور پھر یہیں کے ہو گئے۔ وہ ہزاری باغ کی مٹی میں اس طرح رچ بس گئے اور ہزاری باغ کی مٹی بھی ان میں یوں گھل مل گئی کہ اب وہ ہمیشہ کے لئے اسی مٹی کے ہو رہے۔ نہ انہیں اور نہ ہی یہاں کے لوگوں کو اس بات کا احساس رہا کہ وہ غازیپور والے ہیں۔ جنگل و پہاڑ سے گھری اس پرسکون اور حسین وادی میں انہوں نے زبان وادب کے وہ چراغ روشن کئے کہ اب خواہ کوئی کچھ کہے اسے روشنی کی بھیک اسی چراغ کی لو سے مل رہی ہے۔ ان کے سر میں زبان وادب کی خدمت کا جو سودا تھا اس کی زندہ مثال وارد ہزاری باغ ہوتے ہی 'دائرۂ فکر ونظر' کا قیام اور اس کے بکھر جانے کے بعد 1987ء میں 'کاروان ادب' کی تاسیس ہے۔ آج ہزاری باغ میں اگر لکھنے پڑھنے والوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہے تو یہ انہیں دونوں ادبی تنظیموں کی مرہون منت ہے، جس کی سرپرستی تا عمر وہ کرتے رہے۔ نئی نسل کو شعر و ادب سے وابستہ کرنے کیلئے انہوں نے کیسے کیسے جتن کئے، اس کے سیکڑوں شاہدین ابھی زندہ ہیں، باوجودیکہ بعض بالشتیوں نے ان پر رکیک حملے کر کے خود اپنا قد بڑھانے کی سعئی لاحاصل کی، مگر ظہیر صاحب ان سب سے بے پرواہ خدمت ادب میں مصروف رہے اور پکارتے رہے ؎

میں دشت کی آواز ہوں، سمجھو مجھکو + صحرا کی تگ و تاز ہوں، سمجھو مجھکو
جو بخش دے افکار کو شادابئ گل + میں ایسا ہی انداز ہوں، سمجھو مجھ کو

اپنی 78 سالہ زندگی میں انہوں نے سات شعری مجموعے ہدیۂ قارئین کئے؛ تثلیث فن (نظمیں 1972)، الفاظ کا سفر (غزلیں اور نظمیں 1976)، آشوب نوا (غزلیں 1978)، کہرے کی دھول (نظمیں 1986)، سبز موسم کی صدا (غزلیں 1990)، دعوت صد نشتر (رباعیات 1997) اور لفظوں کے پرند (نظمیں 1998) ان کے علاوہ چار تنقیدی کتب مطالعہ اقبال کے بعض اہم پہلو (2003) 'اردو دوہے۔ ایک تنقیدی جائزہ (2005)، جھارکھنڈ اور بہار کے اہم قلمکار (2009) اور غزل اور فن غزل (2015) نذر ادب کیں۔ نیز ہند و پاک کے موقر ادبی رسائل و جرائد پانچ دہائیوں تک ان کے مضامین و مراسلات سے زینت پاتے رہے۔ ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد سے گوپی چند نارنگ تک ہر بڑے ادیب نے ان کی نظم ونثر پر مختلف زاویوں سے خامہ فرسائی کی، مگر یہ طے نہیں ہو سکا کہ وہ شاعر بڑے ہیں کہ ناقد، اس لئے کہ ان کی دونوں حیثیتیں اتنی جامع ہیں کہ ایک پر دوسرے کو مقدم قرار دینا بیحد مشکل

ہے۔عرصۂ شاعری کے اکثر اصناف پر انہیں استادانہ اور خلاقانہ قدرت حاصل رہی اور ان کے فکر بلیغ وطبع حساس نے ان کے کلام کو متنوع او بوقلموں بنا دیا، وہیں ان کے تنقیدی نظریات وخیالات نے بے ہنگم نقد ونگارش کے جلو میں ایک لطیف راہ نکال کر ادبی گروہ بندی کا شکوہ کرنے والوں کے منہ پر قفل بندی کر کے اپنے اور بیگانے سب سے بھرپور داد وخراج وصول کیا۔ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد نے لکھا:

'ظہیر غازیپوری کی شاعری کے بارے میں مقتدران ادب اور نقادان علم وفن جو کچھ لکھ چکے ہیں اس پر میں کیا اضافہ کر سکتا ہوں، سوا ان الفاظ کے کہ جدید شاعری کے نام پر خرافات کے انبار ہمارے سامنے جمع ہو رہے ہیں۔ظہیر غازیپوری نے سچی اور کھری شاعری کے نوادر سے اردو ادب کے دامن کو بھر دیا ہے۔'

ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ نے تحریر کی:

''ظہیر غازیپوری ایک ایسے شاعر ہیں جن کا نام ربع صدی سے آسمان سخن پر مائل بہ رفعت ہے۔ذہن رسا اور طباعی کے ساتھ ساتھ مشق وممارست نے انہیں فن شاعری پر قابل اعتماد دسترس بخشی ہے''۔

پروفیسر فاروق احمد صدیقی رقمطراز ہیں:

''ظہیر غازیپوری کی تنقیدی بصیرت ان کی شعری صلاحیتوں سے کم نہیں۔وہ بہت عمدہ ادبی نثر لکھتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اچھی نثر لکھنا اچھا شعر کہنے سے دشوار تر ہے۔انہوں نے مختلف شعری اصناف میں اپنی فتوحات کا پرچم بلند کیا ہے اور بحیثیت تنقید نگار بھی اپنی علمیت، وسعت مطالعہ، ژرف نگاہی اور دانشوری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔''

اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے فرمایا:

''اردو میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو ذاتیات سے اوپر اٹھ کر کسی کے بارے میں لکھیں ۔ظہیر صاحب واقعی آزاد ذہن کے مالک ہیں ، بیدار مغز ہیں اور جوہر شناس ہیں۔کھرے کھوٹے کی پہچان رکھتے ہیں۔''

ان آراء کی روشنی میں ظہیر صاحب کی شخصیت وخدمات کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔سادگی، بے تکلفی، بے ریائی، صلہ وستائش سے بے پروائی، نہ تلخ نوائی نہ خودستائی، نہ ہرزہ سرائی نہ ہجو گوئی، صرف اور صرف اپنے کام سے مطلب۔کوئی حملہ ہوا، ہنس کر ٹال دیا، کسی نے تعریف کی، مسکرا کر قبول کر لیا۔غرض وہ نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ شاعر وناقد تھے بلکہ ایک بہترین انسان بھی تھے۔وہ انسان جو حالات کے جبر سے کبھی ڈرا نہیں اور مرنے کی فکر جسے کبھی مغموم نہیں کر سکی

زندہ ہوں، مگر کیوں، مجھے معلوم نہیں + یہ بات کسی کتبہ پہ مرقوم نہیں
ہر جبر میرے واسطے ہے خندۂ لب + میں مرنے کے احساس سے مغموم نہیں

بہر حال موت فاطر ہستی کا اٹل قانون ہے اور اختلافات سے پرے اس دنیا

(بقیہ صفحہ 44 پر)

ناوک حمزہ پوری
DarulAdab.Hamzapur
P.O:Sherghati.Gaya-824211

نیا سال ۱۴۳۸ھ کی آمد پر

جینے کی ہمیں راہ دکھادے مولا
نومیدی کے چنگل سے چھڑادے مولا
چنگل میں پھنسے ہیں علماءِ سو کے
چکّر سے ہمیں ان کے بچادے مولا

ہیں جوش و خروشِ عملی سے محروم
مستقبلِ مردہ ہے ہمارا مقسوم
جذبہ ہے نہ حوصلہ نہ ہے جوش و خروش
کر رحم مسلمانوں پہ قادر و قیوم!

یارب ہمیں دے امن بھی خوشحالی دے
پھر پریم کی الفت کی وہی لالی دے
بھارت ہے وطن اپنا ہے گلشن اپنا
اس باغ کو اچھا سا کوئی مالی دے

ہر ملّی ادارے کو بھی دانائی دے
گم گشتہ جو بھائی ہے اسے بھائی دے
کھو بیٹھے ہیں ہوش گوش ہم اپنے
گوشوں میں ہیں پنہاں ہمیں یکجائی دے

ہے خون رگوں میں نہ دلوں میں جوش
ہم عقل گنوا بیٹھے ہیں باقی نہیں ہوش
اللہ ہمیں شیر کی قوت دے دے
کب تک یوں بنے بیٹھے رہیں ہم خرگوش

ہم قعرِ مذلّت میں دھنسے ہیں یارب
ہم جال میں مسلک کے پھنسے ہیں یارب
ہر وقت کا رونا ہے، نہیں ہے یہ یاد
ہم بھی کبھی ماضی میں ہنسے ہیں یارب

ڈاکٹر محبوب فرید۔
ایڈیٹر شاداب۔ حیدر آباد

ادب اور صحافت

صحافت ایک مقدس اور معزز پیشہ ہے۔ دیانت داری، سچائی، بہادری اور اولوالعزمی کے عملی مظاہرے کا نام صحافت ہے۔ ہر چیز کا علم مستند ذرائع سے حاصل کر کے جامع، موثر، مدلل اور مختصر انداز میں سرعت کے ساتھ قاری کے لئے پیش کر دینا صحافت ہے۔

اس لیے صحافت کو ریاست کا چوتھا ستون قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستانی صحافت آج بھی جمہوریت کے زرین اصولوں کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ صحافت کے ابتدائی دور میں ادب اور صحافت ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم تھے۔ واقعہ نگاری ہی دراصل صحافت ہے۔ وہ مواد جو عوام کے لئے اور عوام کے بارے میں متعینہ وقفہ سے تخلیق کیا گیا ہو، صحافت ہے۔ محمد شاہد حسین لکھتے ہیں "خبر، اطلاع اور جانکاری کا نام صحافت ہے۔" جو واقعات کو تحریر میں نکھار کر آواز میں سجا کر اور تصویر میں سمو کر انسان کے لئے پیش کرے وہ صحافت ہے۔ کسی مسئلہ پر رائے عامہ ہموار کرنا، معاشرے کی تربیت کرنا، قیامِ امن میں مدد کرنا، عوامی رجحانات کی رہنمائی کرنا اور عوام کے حقوق کی حفاظت کرنا بھی صحافت میں شامل ہے۔

ادب زندگی کا آئینہ اور مسرت کا خزانہ ہے۔ افکارِ اعلیٰ کا مجموعہ ادب ہے۔ ادب کا موضوع انسانی جذبہ واحساسات ہوتے ہیں۔ اس لئے ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیا گیا۔ ادب کو دبی ہوئی خواہشات کے اظہار کا ذریعہ بھی کہا جاتا ہے۔ تخیل، ادبی تخلیقات کی اساس ہے۔ آئین سٹائن کہتا ہے۔ "تخیل علم سے زیادہ اہم ہے"

(Imagination is more important than knowledge)

ادب سے معاشرے کی اصلاح کی جاسکتی ہے' کیونکہ ادب میں دلوں کو چھو لینے کی تاثیر ہوتی ہے۔ زبان انسان کے خیالات ظاہر کرنے کا ذریعہ ہے اور زبان ہی سے ادب بنتا ہے۔ ادبی زبان میں ابہام ہوتا ہے۔ اسی ابہام سے معنوی تہہ داری پیدا ہوتی ہے۔ ادبی زبان فصیح وبلیغ ہوتی ہے۔ جب تک انسان کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر تبسم ہے ادب باقی ہے۔ گویا اپنے جسم وروح کے لطیف احساس کے ساتھ گزرنے والے چند لمحات ہی دراصل ادبی تخلیق کا نقطۂ آغاز ہوتے ہیں۔ کسی اچھی یا بری چیز کو دیکھنے' سننے یا محسوس کرنے کے بعد جو تاثر پیدا ہوتا ہے اس کو موثر اور دلنشیں انداز میں دوسروں تک پہنچانے کا نام ادب ہے اور ادب سے زندگی کی سمت متعین ہوتی ہے۔ ادبی تخلیقات میں
واقعات اس طرح پیش کیے جاتے ہیں کہ وہ ہمارے تجربے اور مشاہدے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہم ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ان واقعات کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ افسانے حقیقت بن گئے ہوں۔ اس لئے ہم بعض افسانوں' ناولوں' ڈراموں' فلموں کے کردار اور مکالموں کو برسوں نہیں بھول پاتے۔ ہم آج بھی فردوسی' حافظ' شیکسپیئر ' کالی داس' اقبال اور غالب کو پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں' کیونکہ ان کی تخلیقات میں انسانی جذبات واحساسات ایک جیسے ہیں۔ اس لئے کہتے ہیں شعر وادب میں آفاقیت ہوتی ہے۔

ادب اور صحافت کے درمیان لکیریں کھینچنا آسان نہیں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ادب وصحافت میں دوری کی نسبت ہونے کے باوجود یہ دونوں نسبتیں ایک ہی شخص میں بخوبی جمع ہوسکتی ہے۔ صحافت میں کبھی کبھی ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں ادب اور صحافت ایک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ اخبارات میں لکھے گئے بیشتر کالم اور مضامین ادیبوں کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ادب اور صحافت کے درمیان ایک فرق یہ ہے کہ صحافت کا تعلق عوام سے ہوتا ہے۔ آسان وسلیس اور عام فہم انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ جب کہ ادب چند مخصوص اور با ذوق افراد کے لئے ہوتا ہے۔ ادب حالات واقعات' یا حادثات کا من وعن بیان نہیں ہوتا' بلکہ تخیلات اور محسوسات کو پر لطف حسین اور موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ صحافت کسی نہ کسی مقصد کی پابند ہوتی ہے۔ سادگی اور اختصار اس کی خوبی ہے۔ جب کہ ادب اس طرح کی پابندی کا خوگر نہیں ہوتا۔ ادبی تحریر ادیب کی ذاتی فکر کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ صحافتی تحریر میں کسی واقعہ یا حادثہ کو معروضی انداز میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ جو وقت کی پابند ہوتی ہے۔ جب کہ ادبی تحریر وقت کے قیدو بند سے آزاد ہوتی ہے۔ صحافتی تحریروں کی زندگی مختصر ہوتی ہے۔ مگر اس کے قارئین کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں میں ہوسکتی ہے' لیکن اس کو محفوظ رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ ادبی تخلیقات لمبے عرصے تک محفوظ رکھی جاسکتی ہے۔ اس کی حیات طویل ہوتی ہے۔ اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ کئی نسلیں اس سے مستفید ہوسکتی ہیں' لیکن اس کے قارئین کی تعداد محدود ہوتی ہے۔

ادبی شہ پاروں میں دلوں کو چھو لینے کی تاثیر ہوتی ہے' جو برسوں قائم رہتی ہے جیسے اخبار میں چھپی ہوائی جہاز سے کہ لندن سے حیدر آباد سفر کرنے والی خاتون کا شیر خوار بچہ ممبئی ایرپورٹ سے اغوا کر لیا گیا۔ دوسرے دن اڈیٹر نے پر زور

(بقیہ صفحہ 43 پر)

منظور پروانہ
چکن شاپ، نظیر آباد، لکھنؤ۔ 226018
موبائل: 9452482159

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

میرا پیارا ہندوستان ، نرالی ہے جس کی شان، امن و آشتی کا گہوارہ جو پورے عالم میں مشہور تھا۔ مختلف عقیدوں، مذاہب و مسلک کے پھولوں کا یہ گلدستہ دل کو سرور اور نظروں کو نور بخشتا تھا۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ ملک سونے کا انڈا دینے والی چڑیا کی مثال تھا۔ ہر طرح آسودہ حال لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ملک میں دودھ کی ندیاں بہتی تھیں۔ رعایا خوش حال اور حکمراں بھی انصاف پسند۔ اپنے اس آسودہ حال ملک کو کسی ظالم کی ایسی نظر لگی کہ کایا پلٹ ہوگئی۔ ایک زمانے میں کچھ انگریز تاجر اس ملک میں آئے اور یہاں بس گئے۔ ہندوستانیوں نے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ دل کھول کر مہمانوں کا استقبال کیا' مگر یہ مہمان اتنے بڑے بے ایمان نکلے کہ انھوں نے امن و آشتی کی زمین میں نفرت کا وہ بیج بویا جس سے ''پھوٹ'' کا درخت نکلا اور انگریزوں نے ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کی پالیسی اختیار کر اپنی فوجی طاقت بڑھانا شروع کی۔ آپس میں غلط فہمی پیدا کر کرکے لوگوں کو لڑایا۔ ایک کی مدد کی دوسرے کو شکست دلائی۔ پھر دوسرے کو بھی زیر کر اس پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے پورے ملک پر قبضہ کر اپنی حکومت قائم کرلی۔ اور اس سونے کا انڈا دینے والی چڑیا کو اس بری طرح سے لوٹا کہ وہ سونے کی چڑیا مٹی کی ہوکر رہ گئی۔ دودھ کی نہریں پانی میں تبدیل ہوگئیں۔ جب یہ استحصال حد سے بڑھا تو عوام میں بے چینی بڑھی۔ اس بے چینی نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ غلامی کے جوئے کو اپنی گردن سے اتارنے کے لئے آزادی کی جنگ شروع ہوئی۔ آزادی کی نعمت حاصل کرنے کے لیے آزادی کے متوالے ہر قربانی دینے کے لئے تیار تھے۔ آزادی کے ان متوالوں کا یہ خواب تھا کہ آزادی کے بعد جب ملک کی باگ ڈور یہاں کے لوگوں کے ہاتھ میں آجائے گی تو پھر یہ دیش سونے کی چڑیا بن جائے گا اور دودھ کی نہریں بہنے لگیں گی۔ مگر جب دیش آزاد ہوا تو عوام کی تمناؤں پر اوس پڑ گئی کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ اب غیر ملکی آقاؤں کی جگہ اس ملک کے لوگ آقا بن کر بیٹھ گئے۔ دودھ کی نہریں تو درکنار، جن نہروں میں پانی بہتا تھا وہ بھی سوکھ گئیں۔ وجہ یہ ہوئی کہ آزادی کو پوری آزادی کے ساتھ کیش کرایا گیا۔ اور ملک کے لئے قربانی دینے والوں کو فراموش کردیا گیا۔

آزادی کے بعد آزادی کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ آج ملک

میں یہ حالت ہے کہ ہر شخص پریشان ہے' کوئی عوام کا دکھ درد سننے والا نہیں ہے۔ لیڈر صرف وعدوں کا ڈھیر لگا رہے ہیں اور بھاشن سے ساسن چلا رہے ہیں۔ ہر طرف لسانی، مذہبی، علاقائی تعصب کی بہار ہے۔ اقربا پروری، مفاد پرستی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ اب یہ معمول کی بات ہوگئی ہے۔

آزادی کے بعد سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی ہوئی اور اس تیزی سے ترقی ہوئی کہ ملک ایٹمی طاقت بن کر کمپیوٹر یگ میں پہنچ گیا۔ مگر اخلاقی گراوٹ اس قدر آئی کہ یقین کرنا مشکل ہے۔ جھوٹ کے میزائل ہر وقت داغے جا رہے ہیں اور اسے سچ ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ تاریخ سے کھلواڑ کیا جا رہا ہے۔ فرقہ پرستی کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ آج ملک کی یہ حالت ہے کہ پورا ملک غیر حقیقی خلاؤں میں اس طرح اُڑ رہا ہے کہ سچائی کی زمین سے اس کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ کوئی محکمہ ہو کوئی شعبہ ہو ہر طرف کرپشن کا بول بالا ہے۔

محکمۂ صحت کے مراکز یعنی اسپتالوں کا یہ حال ہے کہ غریب دوا کے علاج سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ڈاکٹروں کے پاس ان کے لئے وقت نہیں' وہ اسپتال میں بھی خوش گپیوں میں مشغول رہتے ہیں' باہر لائن میں مریض کراہتے رہتے ہیں' بے حسی کا یہ عالم ہے۔ دولت مند افراد ڈاکٹروں کے گھر پر ان کی من مانی فیس دے کر اپنا علاج کرواتے ہیں ہیں' جس کے بدلے میں ڈاکٹر ان کو وہ ساری سہولیات اسپتال سے فراہم کراتے ہیں جو حکومت کی طرف سے ہر شہری کو مہیا کرانے کے لیے مخصوص ہیں مگر عام آدمی تک اس کا ایک فیصد بھی نہیں پہنچتا۔ اگر کسی ڈاکٹر نے عام آدمی پر رحم کھا کر اس کے مرض کی تشخیص کی بھی تو دوا لکھ دی کہ بازار سے خرید لو۔ اب ایک دوسرا دھندا بھی بلندیوں پر ہے۔ ملک میں گلی گلی نرسنگ ہوم کھل گئے ہیں۔ ان کا ڈاکٹروں سے معاہدہ ہے۔ ڈاکٹر مریضوں کو صلاح دیتے ہیں کہ اسپتال میں تو علاج ممکن نہیں فلاں نرسنگ ہوم میں اڈمٹ ہوجایئے میں وہاں دیکھ لوں گا۔ دوسری طرف اب ڈاکٹر مریض کی نبض نہ دیکھ کر پہلے مرحلے میں اتنے ٹیسٹ کرواتے ہیں کہ مریض کی جیب ہلکی ہوجائے اور مرض بھول جائے۔ ساتھ ہی ٹسٹ بھی ان کی مرضی کے اداروں سے کرانا ضروری ہے۔۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی مالی منفعت کا معاملہ ہے۔ ڈاکٹر جو پہلے خدمتِ خلق کا جذبہ رکھتے تھے اب مالی منفعت حاصل کرنے میں لگے ہیں۔ اور کیوں نہ کریں؟ انھوں نے بھی اپنی تعلیم کے لئے ڈونیشن دے کر داخلے لیے۔ امتحان میں سو فیصد کامیابی حاصل کرنے

کے لئے کوچنگ سینٹر والوں کو فیس کے علاوہ نذرانے دیے۔ ان طریقوں کو اپنا کر جب وہ ایک عدد ڈگری (لائسنس) کے مالک بن کر لائق ہوئے کہ اپنا بزنس چلائیں تو انھوں نے ایک کامیاب تاجر کی طرح اپنی پوری رقم مع سود کے وصول کرنا شروع کردی۔ اخبارات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس ملک میں فرضی ڈگری، فرضی اسکول، پرچے آؤٹ کرانے کا باقاعدہ دھندا ہو رہا ہے۔ اس طرح بنیاد کمزور ہی نہیں فرضی ہو تو عمارت کا کیا حال ہوگا۔ تعلیم گاہیں اب تعلیم کے مراکز نہ رہ کر عیش و آرام کے اڈے بن گئے ہیں۔ ٹیچر طالب علموں کو پڑھاتے کم ہیں اور ان کی ٹیوشن کرنے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

بات نہروں کی چل رہی تھی۔ دودھ کی نہریں تو کجا اب پانی کی نہریں بھی سوکھی پڑی ہیں۔ اور آب پاشی کا محکمہ جسے عرف عام میں سنیچائی و بھاگ کہا جاتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ بڑے بڑے پروجیکٹ کاغذوں پر تیار ہوتے ہیں۔ کسانوں کی فلاح و بہبودی کے لئے بڑی بڑی اسکیمیں تیار کی جاتی ہیں' مگر عملی طور پر سب اُلٹا ہو رہا ہے۔ کسان بے حال۔ محکمہ کے افسران سے چپراسی تک باڑھ اور سوکھے دونوں کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ بدعنوانی شباب پر ہے۔ عوام پریشان' افسر اپنی تجوریوں کو بھر رہے ہیں' یعنی بے ایمانی پورے ایمانداری سے پنپ رہی ہے۔

ملک کی اقتصادی حالت بھی بہت شاندار ہے۔ آزادی کے بعد سے روپے کی قیمت برابر گر رہی ہے۔ غیر ملکی قرضے بڑھ رہے ہیں۔ قرض ادا کرنے کے لئے قرض لیے جا رہے ہیں۔ سونا گروی رکھا جا رہا ہے۔ ہر ہندوستانی قرض کا بوجھ ڈھو رہا ہے اور غیر ملکوں کی شرائط پر جی رہا ہے۔

نوجوان جو مستقبل میں ملک کے مالک یا کرتا دھرتا ہوں گے ان کا یہ حال ہے کہ وہ مغرب کی نقالی میں مست اور ڈرگ کے نشہ میں بدمست ہیں۔ بغیر محنت کے راتوں رات لکھ پتی بننے کا ارمان سجائے ہوئے ہیں۔ اور اس کی تعبیر کے لئے ہر غلط کام کرنے کو تیار ہیں۔ ان کی نظر میں ملک کا مفاد کچھ نہیں اپنا ہی مفاد سب کچھ ہے۔

آج حال یہ ہے کہ ایمانداری' شرافت اور اخلاق سب کتابوں کی ہو گئیں اور قصۂ پارینہ کے طور پر بیان کرنے والی داستان بن چکی ہیں۔ ہر شخص اپنے مفاد کو پورا کر رہا ہے۔ کوئی مذہب کا ٹھیکیدار بن کر' کوئی سیاسی لیڈر بن کر' کوئی سماجی و ملی کارکن بن کر' نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا دیش گھوٹالوں کا ملک بن گیا ہے۔ اور اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ کون کس کی خبر لے' عوام بنیادی ضرورتوں روٹی' کپڑا اور مکان سے بھی محروم۔ ہم ہندوستانی ہیں ساری دنیا میں ہماری پہچان کی صحیح عکاسی تشنہ عالمی کا یہ شعر کرتا ہی:

مفلسی اور بھوک کا عنوان کس نے لکھ دیا۔ میرے چہرے پر ہندوستان کس نے لکھ دیا

☆☆☆

(ظہیر غازیپوری کی رباعی گوئی کا بقیہ)

اپنے فن کی توقیر کی تمنا ملاحظہ کیجئے۔

خوشبو کی طرح پھیلتی جائے مری فکر۔ ہر شخص کو گرویدہ بنائے مری فکر
بس ایک تمنا ہے مرے دل میں ظہیرؔ۔ عرفان کا درجہ کبھی پائے مری فکر

اردو کی شیرینی اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے والی یہ رباعی ملاحظہ کیجئے:

اک سحر کی جادو کی زباں ہے اردو۔ یعنی رمِ آہو کی زباں ہے اردو
پھولوں کی طرح ذہن اگر رکھتے ہو۔ سمجھو اسے خوشبو کی زباں ہے اردو

یقیناً ظہیرؔ غازی پوری کی رباعیات ان کے وجدان کا ہی ثمرہ ہے۔ الفاظ ان کے ہاں ہر طرح سے مشتمل ہوئے ہیں۔ وہ الفاظ کے نہیں بلکہ الفاظ ان کے تابع ہیں۔ انھیں الفاظ کے بارے میں ظہیرؔ غازی پوری کی یہ رباعیات ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ یہ الفاظ ان کے ہاں کیا کیا جامہ پہنتے ہیں۔

تخلیق و تاثر ہیں' غزل ہیں الفاظ۔ تابش ہیں' پر انوار کنول ہیں الفاظ
نام ان کو کوئی اور نہ دینا لوگو!۔ شعروں میں نئے تاج محل ہیں الفاظ

☆

جذبات کی نرم آنچ میں پل کر الفاظ۔ آتش کدۂ فکر میں جل کر الفاظ
کچھ اور بڑھا دیتے ہیں فن کار کا دل۔ کندن بنے شعلوں میں پگھل کر الفاظ

☆

برتاؤ ہیں آداب نظر ہیں الفاظ۔ یا نازش تہذیب گہر ہیں الفاظ
پہچان بہرحال ضروری ہے ظہیرؔ۔ بارود ہیں' بم ہیں کہ گجر ہیں الفاظ

☆

تحسین نظر چاند ستارے الفاظ۔ یا مسجد و مندر کے منارے الفاظ
جلتے ہوئے اکثر نظر آتے ہیں ہمیں۔ شاخِ لب لالہ پہ ہمارے الفاظ

اور ظہیرؔ غازی پوری نے پورے وثوق سے جتایا ہے کہ

الفاظ کی تفصیل سے ہم واقف ہیں۔ مفہوم کی ترسیل سے ہم واقف ہیں
ہم ہر نئی آہٹ کو سمجھ لیتے ہیں۔ اقدار کی تاویل سے ہم واقف ہیں

الفاظ بھی در آتے ہیں جذبات نئے۔ جب سامنے آئے کبھی حالات نئے
بے شک کسی رجحان نے دستک دی ہے۔ ہر شعر میں ہیں میرے خیالات نئے

اور واقعی ظہیرؔ غازی پوری نے ہر شعر میں نئے خیالات ہی کی رسائی کا کام لیا ہے اور اعادۂ خیالات سے گریز کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اردو دنیا اردو رباعی کے اس کرشمہ ساز رباعی گو سے 2016-11-8 ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو کر رہ گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون

☆☆☆

رزاق اثرشاہ آبادی
شاہ آباد،ضلع گلبرگہ 585228

فکاہیہ

چوٹی کانفرنس

دنیا کے نقشہ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو ہمیں کئی بلند و پست چوٹیاں ملیں گی۔ان سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ کی ہے۔اگر چہ آج سے ساٹھ ستر سال پہلے ایک جاں باز بہادر نے یہ چوٹی سر کر لی تھی لیکن آج بھی اس چوٹی کو سر کرنے کا وہی جذبہ وولولہ باقی ہے جو کل تھا۔ایورسٹ کو سر کرنے میں کتنی جانیں گئیں اور کتنی ٹیموں کو ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا اس کی ایک الگ تاریخ ہے۔لیکن اس چوٹی کو سر کرنے کی خواہش اور آرزو آج بھی ہر کوہ پیما کی ہے۔خوشی کی بات تو یہ ہے کہ ایورسٹ کی اس چوٹی کو کئی چوٹی والیوں نے بھی سر کر کے دکھایا۔جب کہ ان کی دو گز لمبی چوٹیوں کو سر کرنے میں کئی نوجوان ناکام ہو گئے۔ایورسٹ کی چوٹی ،نیل کنٹھ کی چوٹی کی طرح حسینوں کی چوٹیوں کے بھی کئی نام ہیں۔سیدھی سادھی اور موباق میں لپٹی ہوئی چوٹیاں تو آپ نے بھی دیکھیں ہوں گی۔لیکن آج کے فیشن ایبل دور میں کچھ چوٹیاں ایسی بھی وجود میں آگئی ہیں جس سے اندازہ لگا یا جا سکتا ہے کہ ایورسٹ کی بلند چوٹی بھی ان چوٹیوں کے سامنے کچھ نہیں ہے۔خاص طور پر مشرقی چوٹیوں کا مقابلہ کسی بھی مغربی ملک کی چوٹی نہیں کر سکتی ۔خاص طور پہ زلفِ دراز والیاں جب دو دو چوٹیاں لہراتی ہوئی سیر چمن کو آتی ہیں تو دیکھنے والوں کے منہ سے آہ کے ساتھ واہ بھی نکل جاتی ہے۔جس طرح مردانہ اسٹائیل میں دلیپ اسٹائیل، دیوانند اسٹائیل، راج کپور اور شمی کپور اسٹائیل کے بالوں کو شہرت ملی ہے اسی طرح زنانہ اسٹائیل میں سادھنا اسٹائیل، مدھو بالا اسٹائیل، مینا کماری اساٹائیل کی چوٹیاں بھی مشہور ہیں۔

صاحبو! چوٹی ڈالنے میں یا چوٹی گوندھنے میں کس قدر مشقت اٹھانی پڑتی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظرِ لطیف دیکھا ہو۔ہندوستان کے مختلف صوبوں میں مختلف انداز کی چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں۔بنگال کی چوٹی اور پنجاب کی چوٹیوں کو خاص طور پر پسند کیا جاتا ہے۔چوٹی ڈالنے یا چوٹی گوندھنے کا اندازِ دلربائی کیسا بھی ہو لیکن چوٹی ڈالنے کے بعد ادائے خاص سے گردن کو دلربا انداز میں جھٹکتے ہوئے گزرنا ہر چوٹی والے کے بس کی بات نہیں۔پنجابی چوٹی، بنگالی چوٹی، مہاراشٹر چوٹی، پہاڑی علاقوں میں کشمیری چوٹی، اترا آنچل اور جھارکھنڈ کی قبائیلی چوٹی غرض کہ ہمارے ملک میں جس قدر بھانت بھانت کے لوگ ہیں اسی طرح اس ملک میں بھانت بھانت کی چوٹی والیاں بھی ہیں۔کیا مجال کہ ان چوٹیوں سے ایک بھی شرارتی بال باہر نکل آئے، خاص طور پر دلہنوں کی چوٹی کو جس انداز سے گوندھا جاتا ہے وہ اپنے آپ ہی ایک کمال ہے۔چوٹی ڈالنا اور اس خوبصورتی سے ڈالنا کہ نگاہ اُٹھ کر وہیں کی وہیں تھمی رہ جائے۔ہمالیہ کی چوٹی ایورسٹ سر کرنے کے برابر ہے۔لمبی زلفوں والیوں کا جو بھی کمال ہو لیکن چوٹی ڈالنے والیوں کے ہاتھوں کا بھی کمال ہے۔قیامت ڈھانے والی چوٹی اور رومان انگیز چوٹی پر ہمارے شعرائے کرام نے اشعار بھی کہے ہیں۔ایک دو شعر آپ بھی سنئے:

چوٹی میں اس صنم کی چم خم ہے ناگنی کا۔ناگن کی کچلی ہے موباف کچلی کا

ایک شاعر نے تو اور بھی کمال ہی کر دیا۔ع

سیہہ موباف پاجامہ گلابی چمپئی نیفہ۔ڈوپٹہ سرخ انگیا سبز کُرتی زعفرانی ہے

اکثر دو چوٹیاں ڈالنے والی حسینائیں اپنی دونوں چوٹیوں کو پشت پر لٹکانے کے بجائے بہر حفاظت سینہ پر ڈال کر چوٹیوں کا ناگ بنا دیتی ہیں۔یہ چوٹیاں سر کے درمیان میں سے مانگ نکال کر ڈالی جاتی ہیں۔جس طرح دورِ حاضر کے نوجوان گنجے ہوتے جا رہے ہیں اسی طرح صنفِ نازک کے بال بھی دھڑا دھڑ گرنے یا جھڑنے لگے ہیں۔شاید یہ ملاوٹی غذائیں اور ترکاریاں کھانے کی وجہ سے ہوں۔بالوں کو جھڑنے یا گرنے سے بچانے کے لئے روز روز نئے اشتہارات ٹی وی پر آپ نے دیکھیں ہوں گے۔ ہمارے خیال سے سب سے زیادہ اشتہارات بالوں کو لمبا کرنے، ہمارا مطلب دراز کرنے والے تیلوں کی ہوتی ہیں۔آج کل بالوں کو مغربی انداز سے تراشنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔شہروں کی گوریوں کے مقابلے گاؤں کی کالیاں چوٹیوں کی قدردان ہیں۔کسی زمانے میں دلیپ کمار کے بالوں کی لٹ جب پیشانی پر لہراتی تھی تو کنواریوں کے دل مچل جاتے تھے جیسا کہ ایک فلمی گیت کے بول ہیں۔ع

اڑیں جب جب زلفیں تیری ☆ کنواریوں کا دل مچلے سن بلئے

چین دنیا کا ایک ایسا ملک ہے جہاں کے کراٹے سیکھنے والے اور پہلوانی کرنے والے نوجوان ایک لمبی چوٹی سر پر ضرور رکھتے ہیں۔یہ چوٹی شانے سے ہوتے ہوئے کمر تک تو نہیں آتی لیکن گردن تک لٹکتی ضرور ہے۔ہندوستان کے سادھوؤں میں بھی چوٹی رکھنے کا چلن کئی صدیوں سے عام ہے۔ہم ہندوستانیوں کو کرکٹ کھیل بے حد پسند ہے۔اسی لئے اس ملک میں کئی چوٹی کے کھلاڑی پیدا ہوئے ہیں جیسے گواسکر، منجریکر، کپیل دیو، پٹوڈی، بیدی اور بھارت رتن سچن تندولکر۔لیکن

ان میں سے کسی بھی کھلاڑی کے سر پر ''چوٹی'' نہیں ہے۔لیکن ساری دنیا انھیں چوٹی کے کھلاڑی کہتی ہے۔اسی طرح فلمی اداکار دلیپ کمار‘اشوک کمار‘راج کپور‘دیو آنند‘امیتا بھ بچن‘شاہ رخ خان‘سلمان خان‘اکھشے کمار‘راجیش کھنہ وغیرہ فلمی دنیا کے چوٹی کے اداکار ہیں‘یا تھے۔لیکن ان میں سے کسی کے سر پہ چوٹی نہیں ہے۔

آپ نے اخباروں میں ضرور پڑھا ہوگا کہ امریکہ میں یا فرانس میں ساحل سمندر کے کنارے بسے شہر میں چوٹی کانفرنس ہوتی رہتی ہے۔دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے سربراہان ممالک اس چوٹی کانفرنس میں اپنے لاؤلشکر کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔الکٹرانک میڈیا کے نمائندے ایک ایک لمحے کی خبر جاننے اور تصویر کھینچنے کی جستجو میں گھنٹوں دھوپ میں کھڑے رہتے ہیں۔پل پل کی خبریں چینلوں تک پہنچاتے ہیں۔مزے کی بات تو یہ ہے کہ سربراہاں مملکت میں کوئی بھی چوٹی والا نہیں ہوتا۔ بہر حال لمبی لمبی زلفوں والی چوٹیوں سے لے کر چوٹی کانفرنس میں شریک ہونے والے ''بے چوٹی'' سربراہان مملکت تک اس چوٹی کے صدقے میں اپنی شناخت باقی رکھنے میں کامیاب ہیں۔اگر آپ بھی چاہتے ہیں کہ ایسی چوٹی کانفرنس کا اہتمام کریں تو چار چھ دوست مل کر چوٹی رکھیں اور اسے خوب پھولنے پھلنے کا موقع دیں تو کہیں بھی چوٹی کانفرنس کا انعقاد کر سکتے ہیں۔

☆☆☆

(ادب اور صحافت کا بقیہ)

اداریہ لکھا۔چند دن بعد اس خبر سے متاثر ہوکر ایک افسانہ لکھا گیا۔خبر اور اداریئے کو لوگوں نے چند دنوں بعد بھلا دیا۔افسانہ ادب پارہ قرار پایا اور لوگوں نے برسوں یاد رکھا۔اس مثال سے یہ بات واضح ہوئی کہ اصل چیز موضوع سخن نہیں بلکہ اسلوب ہے۔ادبی تخلیق بغیر کسی دباؤ یا لالچ کے معروض وجود میں آتی ہے‘جب کہ صحافت میں اخبار کی طے شدہ پالیسی ہوتی ہے۔مالکِ یا حکمرانوں کا دباؤ ہوتا ہے۔تجارت کی فکر لاحق رہتی ہے۔ایک دوسرے کے جذبات و احساسات‘پسند و ناپسند‘نفع و نقصان اور دیگر مجبوریوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔جب کہ ادبی تحریر میں خالص شخصی اور ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ادبی زبان فکر انگیز‘خوبصورت‘امتیازی اور جاذب نظر ہوتی ہے‘جب کہ صحافتی زبان پر لطف‘معلوماتی‘جامع‘سلیس اور عام فہم ہوتی ہے۔صحافت میں کفایتِ لفظی Economy of words کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔شوکت لفظی سے گریز کیا جاتا ہے۔لفظ کے مترادفات کا استعمال موزوں نہیں سمجھا جاتا۔اختصار اور جامعیت صحافتی تحریر کی جان ہوتی ہے۔ادق اور مشکل الفاظ سے احتیاط برتی جاتی ہے۔سادہ اور آسان الفاظ کے استعمال کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی آسانی سے سمجھ سکیں۔صحافت میں خیالات و الفاظ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

صحافت کا ایک مخصوص مزاج ہے۔جب کوئی ادیب اسی اندازِ فکر اور طرزِ عمل و اسلوب اپنائے گا تو وہ صحافیانہ ادب کی نمائندگی کرے گا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے بعض صحافیوں کی تحریریں ادبی ہوسکتی ہیں۔اور بعض ادیبوں کی تحریریں صحافیانہ ہوسکتی ہیں۔اردو ادب میں ایسی بہت سی عبقری شخصیتیں ہیں جن میں ادبیت کی آن بان کے ساتھ ساتھ صحافت کی چمک دمک بھی موجود ہے۔

ادب اور صحافت میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ ادب خیالی و تصوراتی چیز پیش کرتا ہے۔جب کہ صحافت حقائق پر مبنی ہوتی ہے۔ادبی تحریر فرصت اور خاصی ذہنی کیفیت کی متقاضی ہوتی ہے‘پُرسکون ماحول میں لکھی جاتی ہے۔تحریر کو دوبارہ‘سہ بارہ نظر ثانی کر کے خوب سے خوب تر بنایا جاسکتا ہے۔صحافت عجلت میں لکھا گیا ادب ہے۔آلِ احمد سرور کے مطابق ادب معلومات نہیں تاثرات عطا کرتا ہے۔ادب علم نہیں عرفان دیتا ہے۔یہ نظریہ نہیں نظر بخشتا ہے۔ ادب تنقید حیات ہے۔ "Literature is the mirror of the life" (میتھو آرنلڈ) ادب تسکین کا سبب ہوتا ہے۔

گویا شاعر یا مصنف اپنے جذبات کی تسکین کے لئے لکھتا ہے۔صحافت میں معروضیت کو اور ادب میں موضوعیت کو اہمیت دی جاتی ہے۔ادبی زبان میں ایک سے زیادہ معنیٰ اور مطالب کی گنجائش ہوتی ہے۔صحافت کا مقصد و مدعا صاف و شفاف ہوتا ہے۔ادب و صحافت میں بیان کرنے کی تکنیک میں فرق ہوتا ہے۔جب کہ دونوں کا وسیلہ اظہار زبان اور الفاظ ہیں۔ادب سے مسرت اور صحافت سے حقائق سے راست طور پر آگاہی ہوتی ہے۔ادب میں حقائق کے ساتھ ساتھ تخیل کی آمیزش ہوتی ہے۔ دنیا کی کئی بڑی زبانوں کے نامور ادیب صحافی تھے۔مغربی ادب میں مارک ٹوئین‘ایڈیسن‘مکالے‘تھیکرے وغیرہ۔عربی میں محمد حسین ہیکل اور محمد عبدہ (مصری) اردو میں محمد حسین آزاد‘سرسید‘عبدالحلیم شرر‘رتن ناتھ سرشار‘مولانا حسرت موہانی‘مولانا ابوالکلام آزاد‘ظفر علی خاں‘مولانا عبدالماجد دریا آبادی‘فیض احمد

یعقوبؔ بدایونی
Sd.Md.Istekharuddin
Moh:Qazi pura.Near Nazir wali Masjid
Bijnor -246701(U.P)

عروسِ فکر کو خوشبوئے حنا دینے والا شاعر
اخترؔ شاہجہاں پوری

فیض، اونچے درجے کے صحافی تھے اور ادیب وشاعر بھی۔ ☆☆☆

مسئلہ بن گئی فکر، تفہیم کا۔لفظ کا حسن بھی رائگاں ہوگیا

دنیا کی تاریخ کا یہ کارنامہ قابلِ توجہ ہے کہ انسانی ذہن اپنے کارناموں سے آنے والی نسل کو آگے بڑھانے کے لئے فکری عمل بروئے کار لاتا ہے۔ اچھے اور بُرے ادبی کارنامے قدیم ہوں یا جدید اپنے اظہار کی نوعیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ادھر تاریخی اعتبار سے انیسویں اور بیسویں صدی میں اردو ادب کا یہ ایک اندوہناک المیہ ہے کہ بقول جناب پروفیسر رشید احمد صدیقی ''سیاسی استبلا نے شرفائے ادب کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا' آرٹ اور ادب کے خدمت گزاروں کو سیاسی نظریوں سے اتنا سرشار نہ ہونا چاہئے کہ وہ ادب کے صحیح خدوخال اور صالح تقاضوں کو فراموش کر جائیں یا اُن کو مسخ کرنے کی کوشش کریں۔'' جدیدیت کے علم برداروں نے اکثر و بیشتر کچھ ایسا ہی کیا ہے۔میں جناب اخترؔ شاہجہان پوری کو قابل تحسین گردانتا ہوں کہ انھوں نے اپنی شاعری کو ایک معمّہ یا چیستانی شاعری سے الگ کرتے ہوئے بامعنٰی اور صالح اقدار پر مبنی شاعری کی ہے۔ہم جدیدیت کے حسن کو کوسنے اور غلط ٹھہرانے کے بجائے ہم یہ کیوں نہیں کہتے

بدگماں ہے تو وہی مورد الزام ہو کیوں۔ کچھ نہ کچھ تو مری تقصیر بھی ہو سکتی ہے
اور جب اپنی ہی تقصیر ہی ٹھہری تو پھر یہ تو ہونا ہی تھا ؎

ہے عاجزی بھی اُسی کی وقار اُس کا ہے۔کوئی بھی رنگ ہو بس اشتہار اس کا ہے

جناب اخترؔ شاہ جہاں پوری نے پُرانے اور فرسودہ لہجوں کو نیا رنگ دے کر جدید لہجہ عطا کیا ہے۔بطور مثال پُرانے شاعروں نے رنج وغم اور درد والم کا اپنے اپنے ڈھنگ سے بیان کیا ہے لیکن یہاں شاعر نے اپنے شعر میں ایک جداگانہ حسین پہلو نکالا ہے' وہ کہتا ہے ؎

قبائے درد جب سے زیب تن ہے۔ خوشی کو اپنے اندر دیکھتے ہیں

قبائے درد میں خوشی کو پوشیدہ دیکھنا ہی شاعر کی بصیرت کی عکاس ہے۔اخترؔ شاہ جہاں پوری مادی و روحانی زندگی کے مابین شدید سے شدید تر ہونے والے تضادات کے اُس عہد میں جی رہا ہے جہاں علم کا فقدان ہے اور عمل میں کم نگاہی و بے عملی نظر آتی ہے اور اخترؔ صاحب یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں ؎

فکر وعمل کا یہ تضاد عہدِ جدید کے آدمی کو جس طرح کی دوہری زندگی جینے پر مجبور کر رہا ہے اُس سے آج کا عہد نہ تو صحیح معنوں میں دینی و اخلاقی قدروں کی حامل رہا ہے اور نہ ہی جدید مادّی زندگی کے تقاضوں کے لئے موزوں ہے' اس لئے ؎

فلسفی ہے کہ مفکر ہے کہ شاعر اخترؔ ۔اُس کے اشعار کو معیار پہ رکھّا جائے

اِسی وجہ سے شاعر یہ کہنے پر حق بجانب ہے ؎

خیالوں میں نئے پیکر سجانا۔مگر الفاظ میں جدت نہ کرنا

دینی و مادّی زندگی کے تضادات میں جی رہے آج کے آدمی سے الگ شاعر نے عام آدمی کی حیثیت سے اپنی شناخت الگ قائم کرنے کی سعی کی ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کا مستحق ہے۔

☆☆☆

(ظہیر غازیپوری جنھیں برسوں۔۔۔۔۔کا بقیہ)

میں بس یہی مرکز اتفاق ہے۔زندگی کی حقیقت بس یہی ہے ؎

آپ اس پر جتنے چاہیں تبصرے کرتے رہیں+ ریت پر تعمیر عالی شان گھر ہے زندگی

مگر موت کسی کے لئے فنا کا پیام لیکر آتی ہے اور کسی کو حیات ابدی بخش دیتی ہے۔ظہیر صاحب بھی بلاشبہ انہیں لوگوں میں تھے جنہیں ان کے کارنامے کبھی مرنے نہیں دیں گے، جب تک اردو زبان وادب زندہ ہے، اردو کا یہ سچا اور بے لوث

غزلیات

خادم بھی زندہ رہے

مہدی پرتاپ گڑھی

28اسکول وارڈ۔ پرتا پگڈھ۔1

وہ کہہ رہے ہیں کہ عارض پہ گُل کے شبنم ہے
مری سنو! یہ بہاروں کے خون کا نم ہے
جدید ذہنوں نے تہذیب کو حیات تو دی
ہیں ایسے گوشے جہاں حسنِ زندگی کم ہے
ہیں نیون لائیٹیں، بجلی کے قمقمے تو بہت
مگر یہ سچ ہے کہ ذہنوں میں روشنی کم ہے
ہزار بھیڑ ہے شانوں سے چھلتے ہیں شانے
بشر تو ہوگیا روبوٹ آدمی کم ہے
مچل کے بچوں کی مانند مانگ رو رو کر
تری دعاؤں میں اخلاصِ بندگی کم ہے
نہیں جو غیروں میں اب جذبۂ خوش اطواری
کچھ اپنوں میں بھی تو اخلاصِ آگہی کم ہے
اک عمر گزری ہے مہدیؔ ادب کی دنیا میں
مگر کلام میں کچھ حسنِ شاعری کم ہے

گا۔انشاءاللہ!

☆☆☆

اختر کاظمی

394,Arabpur,NearBasantTalkies
Fatehpur-212601(U.P.)

شاید کسی مقام پہ یاور نیا ملے
تو بے گھری کے بعد کوئی گھر نیا ملے
ہے مضطرب نگاہ کہ منظر نیا ملے
افکار کی طلب ہے کہ محور نیا ملے
ممکن نہیں طویل مسافت کے بعد بھی
دھرتی نئی ملے کوئی اَمبر نیا ملے
ہونٹوں پہ تشنگی نہ ہو سر پر نہ دھوپ ہو
ساحل ہرا بھرا ہو سمندر نیا ملے
تشکیلِ نو اگر ہو ہمارے وجود کی
پیکر نیا ہو اور مقدّر نیا ملے
ہیں آسماں کے کھیت میں سیارگاں بہت
شاید اسی ہجوم میں اخترؔ نیا ملے

جاوید ندیم

103,Qasva,Plaza,Patel
Mohall,Panvel-410206
Navi Mumbai

زندگی کی کمی رہ گئی
تیری حسرت بنی رہ گئی
پھول کوئی بھی مہکا نہیں
برف اب کے جمی رہ گئی
خواب دیکھے تھے برسات کے
خشک دل کی ندی رہ گئی
میں کہ قسمت سے پتھر ہوا
قید میں وہ پری رہ گئی
ابر بستی پہ برسا کیا
سوکھی کھیتی مری رہ گئی
کہنا چاہا تھا جو رہ گیا
بات وہ ان سنی رہ گئی

ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق

سیوان
Mob-8292851786

ایک دن وہ آئے گا پوچھو نہ کیا لے جائے گا
چاند سورج آسماں ہر شئے اُڑا لے جائے گا
گھر اُسی کا جگمگائے گا ستاروں کی طرح
آندھیوں سے اب بچا کے جو دیا لے جائے گا
زندگی کی راہوں میں یوں پھونک کر رکھنا قدم
تجھ کو پستی میں غلط اک فیصلہ لے جائے گا
چیز کچھ ایسی بھی ہے کوئی چُرا سکتا نہیں
کون ہے جو چھین کر مہر و وفا لے جائے گا
میں نے خود کو اس کی کشتی کے حوالے کر دیا
وہ سہارا دے کے تیرا حوصلہ لے جائے گا
زندگی میں صبر بھی مشتاقؔ ایسی چیز ہے
لاکھ دشمن ہو زمانہ اس کا کیا لے جائے گا

اشتیاق کامل

Editor,Quirtas.Nagpur

جب بھڑک اٹھتے ہیں مفلس کی ضرورت کے چراغ
نور کھو دیتے ہیں پھر اس کی شرافت کے چراغ
جھوٹ کی آندھیاں زور اپنا نکالیں جتنا
بجھ سکیں گے نہ کسی طور صداقت کے چراغ
ہے ہوا بغض و تعصب کی خدا خیر کرے
بجھ نہ جائیں کہیں اب امن و اخوت کے چراغ
راکھ کر دیتے ہیں عصمت کا محل دم بھر میں
شعلہ بن کر جو بھڑک اٹھتے ہیں شہوت کے چراغ
پھر کہاں ہوگی گناہوں کی سیاہی جس دم
چشمِ مومن میں جلیں اشکِ ندامت کے چراغ
بن کے اسلام کی تاریخ کا بابِ روشن
اب بھی ضوبار ہیں فاروقی عدالت کے چراغ
کاملؔ و سرمد و منصور کا پیغام ہے یہ
رکھنا ہونٹوں کے منڈیروں پہ صداقت کے چراغ

نادر اسلوبی

H.No:6-5-6,Hanamkunda
Warangal-506011(T.S)

اشکوں نے تو کر دی ہے شروعات ذرا سی
گرمی کو بڑھا دیتی ہے برسات ذرا سی
یارب مجھے آدابِ محبت تو سکھا دے
کام اتنا بڑا اور مری ذات ذرا سی
تفصیلی ملاقات کا لطف اور ہی کچھ ہے
کروائی ہے خط نے تو ملاقات ذرا سی
کیچڑ نہ اُچھالا کرے احباب پہ کوئی
اک آگ نہ بن جائے کہیں بات ذرا سی
جو کچھ بھی ترے پاس ہے کافی ہے وہ نادرؔ
مغرور نہ کر دے کہیں بہتات ذرا سی

میکش اجمیری

MotiBazar.NimaHira
Rajasthan-312601

زلف کی برہمی بڑھ گئی　　میری دیوانگی بڑھ گئی
چند لمحے تمھیں دیکھ کر　　مختصر عمر بھی بڑھ گئی
دیکھ کر میری برگستگی　　دشمنوں کی خوشی بڑھ گئی
آسماں کے دیے بجھ گئے　　تیرگی رات کی بڑھ گئی
بزم میں آپ کیا آگئے　　ہرطرف روشنی بڑھ گئی
جس قدر اس کا عہدہ بڑھا　　اس قدر عاجزی بڑھ گئی
جب سے میں اہلِ زر ہوگیا　　شہر میں دوستی بڑھ گئی
ربط دشمن سے جب بھی بڑھا　　یار کی بے رخی بڑھ گئی
بارشِ غم نہ میکشؔ ہوئی　　تیری آسودگی بڑھ گئی

عبدالشکور پروانہ

Islampur.NearGausia
Masjid.P.O:Makhdumpur
Dt:BOKARO(Jharkhand)

خوف و دہشت کی تلوار ہر موڑ پر
زندگی ہے یہ بے زار ہر موڑ پر
ایک بیوہ کا بیٹا کیا مارا گیا
گرم سارا ہے بازار ہر موڑ پر
آج کل ہے عجب شہر کی شام بھی
مست ملتے ہیں دو چار ہر موڑ پر
حادثوں کے گزر جانے کے بعد بھی
چُست ہوتی ہے سرکار ہر موڑ پر
گردشِ دور کا حال مت پوچھیے
ہے جدا یار سے یار ہر موڑ پر
ذکر عالم کا پروانہؔ کیا میں کروں
ہیں تباہی کے آثار ہر موڑ پر

سید اسلم صداؔ آمری

22/23BooBegum Street
2nd lane,Mount Road
Chenni-600002
Mob-9444752605

میں اک مسافرِ شب تیرگی کی ناؤ میں ہوں
ترے کرم کے مسلسل ہی اک بہاؤ میں ہوں
ہے شامیانہ ہر اک سُو تری رفاقت کا
ہوں راہی صحرا کا لیکن حسیں پڑاؤ میں ہوں
یہ اور بات کہ اظہار کچھ نہیں کرتا
میں آئینہ ہوں ترے حسن کے بناؤ میں ہوں
میں جیسے گلشنِ ہستی کا ہوں خلیل کوئی
کہ آج بھی کسی نمرود کے الاؤ میں ہوں
بہار آ کے جو دستک دے میری چوکھٹ پر
تو کہنا آج میں صحرا کے بھاؤ تاؤ میں ہوں
میں جانتا ہوں کہ میری بساط کتنی ہے
تُو جانتا ہے میں کتنے ترے دباؤ میں ہوں
جو پاس رہ کے صداؔ مجھ سے دور رہتا ہے
میں لمحہ لمحہ اسی کی طرف کھنچاؤ میں ہوں

پی۔ پی۔ سریواستو رندؔ

R-16,SECTOR-XI,NOIDA
Mob:09711422058

وحشتیں رشک کریں، رات کا جلوہ دیکھیں
رات کی بھیڑ میں سنّاٹوں کا مجرا دیکھیں
پشت ہا پشت نے جھیلا ہے یہ بوڑھا سورج
ساعتیں اب نئے سورج کا اجالا دیکھیں
اپنے تابوت کو کاندھے پہ اٹھانا مشکل
بے کفن لاش کو کب تک یوں ہی سڑتا دیکھیں
رات زندہ ہے ابھی، جاگ رہے ہیں جگنو
جسم کی بھیڑ میں سانسوں کا تماشا دیکھیں
میری بستی کی فصیلیں تو بہت اونچی ہیں
پنکھ لگ جائے تو اس پار کا جلوہ دیکھیں
جسم کی قبر سے نکلیں تو یہ پوچھیں اے رندؔ
کیوں تھکن اوڑھ کے سویا ہے زمانہ دیکھیں

ڈاکٹر یوسف صابر

LunarHousingSocietyN-12
Plot No-2616 CIDCO
RoazBagh.Aurangabad-1

گلے سے لگ گئے لیکن ملے نفرت سے تم ہم سے
یوں ہی کیا پیش آتے ہیں بتاؤ اپنے ہمدم سے
وہ رو رو کر اداکاری میں بازی لے گیا مجھ سے
میں چپ تھا اس لیے بیگانی تھی محفل مرے غم سے
چمن میں دونوں تھے کھوئے ہوئے پر فرق اتنا تھا
انھیں پھولوں سے رغبت تھی، عقیدت ہم کو شبنم سے
بڑھیں نہ غیبتیں احباب کا حلقہ جو بڑھ جائے
یہی کچھ سوچ کر شاید وہ ملتا ہے بہت کم سے
سمجھ ہی نے ہمیں اپنی بہت نقصان پہنچایا
نمک زخموں پہ وہ نکلے لگے جو لوگ مرہم سے
وہ محفل ہو ادب کی یا ہو صابرؔ جشن خوشیوں کا
مری کوشش یہی ہوگی بڑھے رونق مرے دم سے

تجمل شفائی

Kagzipura.P.O:Erandol
Jalgaon-425109(M.S)

کسی کا شر سے الجھنا خراب بھی ہوگا
تمام شہر پہ بے حد عذاب بھی ہوگا
ہر ایک شخص جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے
وہ سوچتا نہیں اک دن حساب بھی ہوگا
چلو کہ آج جہالت کو کاندھا دے آئیں
کسی کی موت میں جانا ثواب بھی ہوگا
جو دعویٰ کرتا ہے دنیا میں پارسائی کا
ہمیں یقین ہے وہ بے نقاب بھی ہوگا
یہ کس کے واسطے سارا چمن اٹھا لایے
حسین پھولوں میں دیکھو گلاب بھی ہوگا
ہر ایک شے پہ تجملؔ زوال آتا ہے
بڑھاپا آیے گا رخصت شباب بھی ہوگا

ڈاکٹر رضیؔ امروہوی

AbadMarket.Doodhpur.Aligarh
موبائل:9897601669

جو لے کے آتا ہے بیوی جوان سردی میں
وہ ڈالتا ہے مصیبت میں جان سردی میں
ہمیں بھی کاش کوئی ایسی خادمہ مل جائے
جو گرم رکھّے ہمارا مکان سردی میں
جگا نہ دیر تلک رات کو ہمیں جاناں
سحر میں دینی ہے اُٹھ کر اذان سردی میں
زیادہ قربتیں اچھّی نہیں حسینوں کی
ٹھٹھر نہ جائے تری آن بان سردی میں
ہدف پہ تیر چلانا بہت ضروری ہے
نہ رکھنا چاہئے ڈھیلی کمان سردی میں
چھوارے دودھ میں اوٹا کے رات کو کھاؤ
نکھر کے آتی ہے چہرے کی شان سردی میں
یہ مشورہ ہے نئی شاعرات کو میرا
وصال کے ہوں فوائد بیان سردی میں
کھلا دو کیسی بھی معجون تم بنا کے رضیؔ
نہ ہوگا کوئی بھی بوڑھا جوان سردی میں

عبدالسلام کوثرؔ

ShasrtriChowk.Tulsipur.
Rajnandgaon-491441(C.G)

ہم نے کب شکوہ کیا تقدیر سے
ہاں مگر الجھے رہے تدبیر سے
میں سمجھتا ہوں عبادت ہے مری
گفتگو کرنا تری تصویر سے
رشکِ جنت اور آدم کا لہو
کیا کہوں میں وادیِ کشمیر سے
بادشاہی نفس کی تسخیر ہے
یہ سبق ملتا ہے عالمگیر سے
سیکھ لیجے حق بیانی کی ادا
شمسؔ سے، سقراط سے، شبّیر سے
منصفی بھی ہے سیاست کی اسیر
کیا ملے گا عدل کی زنجیر سے
سنگ دل تو سنگ دل ہے سربسر
فائدہ کیا نالۂ شبگیر سے
یہ حقیقت سب کو سمجھا دو سلامؔ
دین کا رشتہ نہیں شمشیر سے

عبدالحئی پیام انصاری

PiprauliBazar.Gorakhpur-273212
Mob-9453814135

کارنامے جن کے دہرائے گئے
موردِ الزام ٹھہرائے گئے
جب کبھی کھینچی گئی کوئی لکیر
ہم حدوں کے پار ہی پایے گئے
کھینچ لائی ہم کو مٹی کی کشش
ہم کہاں تھے اور کہاں لایے گئے
دام پوچھے ہے گدائے شہر بھی
جب سے ہم بازار میں لایے گئے
ہم محبت میں فقط رسوا ہوئے
کچھ تو دیواروں میں چنوائے گئے
ہم تو رسوا ہو کے لوٹے ہیں پیامؔ
تم تو خوش قسمت تھے بلوائے گئے

اوج اکبرپوری

Rohtas-821311(Bihar)

کیوں لرزہ براندام ہو تم برق تپاں سے
ہمت دکھاؤ کام کرو عزمِ جواں سے
الفاظ و معانی کا سمندر لئے ہوئے
وہ طرز سخن میرؔ سا ہم لائیں کہاں سے
گفتار کی یہ شعلہ بیانی معاذ اللہ
کردار بہت قتل کیے اس نے زباں سے
کچھ کہنے سے بہتر ہے کہ خاموش ہی رہیے
کھل جاتا ہے سب عیب و ہنر طرز بیاں سے
وہ لوٹ کر واپس نہیں آتا ہے کبھی بھی
جو تیر نکل جاتا ہے اک بار کماں سے
یہ باد سموم ایسی چلی ہے کہ کہیں کیا
مرجھا گئے سب پھول گلستاں کے خزاں سے
اک تم ہی نہیں اوجؔ گرفتار مصیبت
ہر شخص ہے بے چین یہاں درد نہاں سے

اظہر نیّرؔ

Vill,&P.O.Blarhulla
Via:Kansi Simri,Barhulia,
Dist,DABHANGA(BIHAR)

کھو چکے ہیں اپنے سائے دھوپ میں
کون اب ہم کو بچائے دھوپ میں
پیڑ سایہ دار سارے کٹ گئے
اب کہاں رہگیر جائے دھوپ میں
زندگی کے دشت نے آواز دی
سایہ اپنا چھوڑ آئے دھوپ میں
ماں کا دامن چھوڑنے والے تجھے
کون جلنے سے بچائے دھوپ میں
بھاگ کر عشرت کدوں کی بزم سے
ہم نے اپنے غم چھپائے دھوپ میں
کاش کہ بھر جائے نیّرؔ اس طرح
زخم پہ مرہم لگائے دھوپ میں

شارق عدیل

At/P.O:Marhra
Didt:Etah-207401(U.P)
Mob-9368747886

دھری ہے نیند ان عزت مآبوں کے تلے
دبا کر ذہن کو سوجا کتابوں کے تلے
سفر میں کر رہا ہوں کس خلا کے درمیاں
اندھیرے چھا رہے ہیں ماہتابوں کے تلے
یہ کس کے لمس کا رگ رگ پہ طاری ہے نشہ
مہکتے ہیں بدن کے زخم خوابوں کے تلے
نہیں گنجائشیں تو رنگ و بو تقسیم کر
رواں ہے خون اپنا بھی گلابوں کے تلے
نہ جانے کس لیے میں آج ہنستا ہوں بہت
چراغِ زندگی رکھ کر عذابوں کے تلے
وہ کیا دن تھے مہکتا تھا ہمارا ہوسٹل
اجالے رقص کرتے تھے کتابوں کے تلے
لہو کا شور ہوجائے نہ دل میں منجمد
بدن بوجھل ہوا جاتا ہے خوابوں کے تلے

رحمت علی رحمتؔ
Moh:WaliGanj,Po:Arrah
Dist:Bhojpur-802301(Bihar)

رہے ہمیشہ جو شاخ و شجر زیاں کرتے
بھلا وہ کیسے بیاباں کو گلستاں کرتے
ہے شکوہ سنج کڑی دھوپ کے جو ہم سفراں
نہ ہم تھے ابر کے صحرا میں سائباں کرتے
مسافرت میں کہیں بھی قیام گہہ نہ ملی
گزارا وقت کو آخر یہاں وہاں کرتے
سناؤ جس کو تو تنقید ہی تو کرتا ہے
ہم اپنا حال زمانے سے کیا بیاں کرتے
بس ہم نے لہر پہ بہنے دیا سفینے کو
نہ سازگار ہوا تھی کہ بادباں کرتے
اگر فقیہہ صفت ہم بھی ہوتے اے رحمتؔ
چراغ بن کے زمانے کو ضوفشاں کرتے

ڈاکٹر کلب حسن حزیںؔ
Sakrawal East.Tanda
ASmbedkar Nagar-224190(U.P)

اتنی ذرا سی بات پہ مہجور ہوگئے
مجھ کو اکیلا چھوڑ کے تم دور ہو گئے
یکسوئی ایسی عشق میں اور حسن میں ہوئی
ان کے بھی چہرے بزم میں پرنور ہو گئے
برسی ہے چشمِ ناز سے کچھ اس طرح شراب
محفل میں جتنے لوگ تھے مخمور ہوگئے
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
ان کی بس اک نگاہ سے مجبور ہوگئے
چشمِ فسوں کی دیکھ لے نیرنگیاں جہاں
رہگیر رہگزر کے بھی مخمور ہوگئے
بے نامِ زمانہ تھے جو دنیائے ادب میں
بس اک غزل سے شہر میں مشہور ہوگئے
ان کی ادائے خاص پہ حیرت ہے اے حزیںؔ
مجھ کو تڑپتا دیکھ کے مسرور ہوگئے

رمیش کنول
6-ManglamViharColony
AraGardenRoad.JagdevPath
Patna-800014

دزدیدہ نگاہی سے نہیں کوئی شکایت
حالات کی راہوں میں لٹے اہلِ محبت
اے دیکھنے والو! یہ مری سادگی دیکھو
قاتل سے بھی رکھتا ہوں میں امیدِ عنایت
انجان تھا ہر شخص کہانی سے ہماری
حاصل ہوئی تجھ سے ہی ہمیں عظمت و شہرت
یادوں کی مہکتی ہوئی زنجیرِ طلائی
پہنے ہوئے ہے آج بھی ناکامِ محبت
افسانہ سہانا ہے کنولؔ عشق کا لیکن
کچھ بھی نہیں اس راہ میں جز اشکِ ندامت

مظہر محی الدین
C/o.IsmailPanwale,3rdCross,9-7-680
NearMhanthaliya. School,B.T. Patil
Nagar, KOPPAL-583231

پیکرِ حسنِ مجسم، آج پھر یاد آ گیا
جان سے بھی پیارا ہم دم، آج پھر یاد آ گیا
پھول کو آئے پسینہ، منہ چھپائے گلستاں
ایسا وہ فردِ مکرم، آج پھر یاد آ گیا
کیا مسیحائی تھی اُس کی کیا علاجِ دردِ وغم
دستِ رحمت، جیسے مرہم، آج پھر یاد آ گیا
اک ادائے دلربا، صحرا کو مہکاتی ہوئی
اک خرامِ عزمِ پیہم، آج پھر یاد آ گیا
اُس کا طرزِ گفتگو، گویا پہاڑی آب جو
کشتِ دل سیراب ہردم، آج پھر یاد آ گیا
یہ بھی اک نعمت ہے مظہرؔ لطف اس کا اور ہے
رنجِ پیہم، دائمی غم، آج پھر یاد آ گیا

صابر فخر الدین
Opp:PoliceQuarters.MainRoad
Yadgir-585202(Karnataka)

گری دیوار جب وہم و گماں کی
حقیقت کھل گئی اس مہرباں کی
خود اپنے آپ کو بھولا ہوا ہے
مگر ہے فکر اس کو دو جہاں کی
نہیں ہے کوئی موسم بھی تو ایسا
جو بن جائے دوا دردِ نہاں کی
کہاں اب پہلے جیسی دوستی ہے
یہ تم بھی بات کرتے ہو کہاں کی
زمیں پر رہ کے بھی وہ دیکھیے تو
ردا اوڑھے ہوئے ہے آسماں کی
جو ہونا ہے وہی ہو کر رہے گا
کسے ہے فکر اب سود و زیاں کی
وہ دن بھی آئے گا صابرؔ کسی دن
کہانی ختم ہوگی جسم و جاں کی

بدر محمدی
ChandpurFateh.P.O:Baryarpur
Dist:Vaishali-843102
Mob-9939311612

خشک آنکھوں سے نم آنکھوں سے
وابستہ ہے غم آنکھوں سے
بھر آتے ہیں یونہی آنسو
روتے نہیں ہیں ہم آنکھوں سے
آنکھوں میں وہ دل سے آیا
جائے کہاں اب غم آنکھوں سے
پی نہ سکیں وہ خوں کا پانی
اشک ہے جاری نم آنکھوں سے
تیری خاطر پگھل گیا میں
میری خاطر جم آنکھوں سے
دیکھنے کی وہ چیز ہے لیکن
دیکھا جائے کم آنکھوں سے

رؤف خوشتر

موظف پرنسپل سرکاری کالج، بیجاپور

موبائل:03538445870

افسانہ

ذرا نم ہو۔۔۔

پروفیسر وِٹھل راؤ آنندراؤ مقامی کالج میں صدر شعبۂ تاریخ کی حیثیت سے فائز تھا۔اعلیٰ ذات کے ادارے کے تحت یہ خانگی کالج اپنے ہی اعلیٰ ذات فرقے کے اساتذہ اور اپنے ہی طبقہ کے طلباء وطالبات کی وجہ سے مخصوص ومشہور تھا۔ چھ فُٹ سے بھی نکلتا ہوا بلند قد سُرخ وسفید رنگ' گول بھرے بھرے گال لئے چہرہ' چوڑی پیشانی چمک دار آنکھیں ' گھنگھریالے بال ولا وِٹھل راؤ پیشانی پر نمایاں تِلک لگا کر جودھ پوری سوٹ میں ملبوس کالج آتا۔ایک مخصوص فرقہ کی تاریخ کو وہ محمود غزنوی سے شروع کر کے علاء الدین خلجی تک لے جاتا اور پھر اورنگ زیب پر اس کا اختتام ہوتا۔اعلیٰ ذات کا فرد ہونے پر فخر کرتا اور اپنے ہی اعلیٰ طبقہ کو ملک کا نجات دہندہ طبقہ سمجھتا۔ملک کے عہدِ قدیم کو وہ تابناک اور ایک مخصوص فرقہ کے ایک ہزار سال کے گراں قدر دور کو افسوس ناک بتلا کر خوشی محسوس کرتا۔طلباء کو پھر سے اسی عہدِ عتیق کی قدروں کے احیاء کی پُرزور تلقین کرتا۔

کالج انتظامیہ کی نااہلی کی بناء پر حکومت نے اِس کالج کو اپنی تحویل میں لے لیا اور کافی عرصہ سے خدمت سرانجام دینے والے اساتذہ کا دوسرے سرکاری کالجوں میں تبادلہ کر دیا۔وِٹھل راؤ کا بھی تبادلہ دوسرے شہر میں اسی اقدام کے تحت ہوا۔نئے شہر میں سرکاری کالج شہر سے کافی دور تھا' اس کے اطراف سرکاری کواٹرس تھے۔سہولت کے لئے مجبوراً وِٹھل راؤ کو بھی کوارٹر میں رہنا پڑا۔مگر یہ کیا اس کے کوارٹر کے ایک طرف پسماندہ طبقہ والے ہریجن دیوداس اور دوسری طرف مسلمان خان صاحب سرکاری ملازم مُقیم تھے۔مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ بالجبر رہنے لگا۔اپنے بچوں کو سختی سے منع کیا کہ وہ پڑوسیوں کے بچوں کے ساتھ نہ کھیلیں۔لیکن بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔اس کے باہر جاتے ہی بچے دونوں پڑوسیوں کے ساتھ کھیلتے رہتے۔چونکہ سرکاری کالج میں مختلف مذہب' ذات والے اساتذہ اور طلباء تھے تو ایسے ماحول میں وہ اپنے آپ کو غیر مطمئن محسوس کرنے لگا۔اب وہ محتاط انداز میں لیکچر دیتا اور حتی الامکان دوسرے مذاہب اور ذات والے اساتذہ سے کٹا کٹا رہتا گویا کہ یہاں اِس نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ سی بنالی تھی۔

ایک دن جب وہ نیند سے صبح بیدار ہوا تو عجیب معاملہ یہ ہوا کہ اُس کے سُرخ جلد پر سیاہ داغ نمایاں ہوئے جو اِس کی شاندار شخصیت کو مسخ کئے ہوئے تھے۔بہت علاج کیا مگر دھبّے جوں کے توں قائم رہے۔تبھی اسٹاف میں کسی نے مشورہ دیا کہ پُرانے شہر میں علاء الدین نامی قابل حکیم رہتے ہیں' اُن کو بتلایا جائے۔پہلے تو وہ سٹپٹایا کہ ایک مسلمان حکیم کے پاس
کیوں جاؤں لیکن بیوی بچوں کے بے حد اِصرار پر اپنے ایک مسلمان پروفیسر کے ہمراہ بادلِ ناخواستہ حکیم کے مطب میں پہنچا۔حکیم علاء الدین کا شفا خانہ اِن کے مکان کے سامنے والے حصہ میں ہی تھا۔حکیم صاحب نے بغور اِن سیاہ داغوں کا معائنہ کیا اور فرمایا کہ پروفیسر صاحب آپ کا خون فاسد ہو گیا ہے۔چالیس دن تک بلا ناغہ جڑی بوٹیوں کو پیس کر عرق نکال کر تازہ عرق آپ کو صبح نہار پیٹ یہاں آ کر پینا پڑے گا۔انشاءاللہ خون سے فاسد مادہ نکل جائے گا۔جب خون صاف ہوگا تو دھبے چلے جائیں گے۔

گھر آ کر بڑبڑانے لگا کہ حکیم پاگل ہو گیا ہے میں جو اعلیٰ ذات کا ہوں میری رگوں میں بہترین خون ہے' میرا خون کیسے گندہ ہو سکتا ہے۔مگر ان دھبوں کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔پھر اہلِ خانہ نے زور دیا کہ حکیم کا علاج کر کے دیکھیں۔طوعاً وکرہاً وہ راضی ہو گیا۔علیٰ الصباح وہ اپنی اسکواٹر پر حکیم صاحب کی رِہائش گاہ جاتا اور جڑی بوٹیوں کا کڑوا عرق پیتا۔روزِ اول سے ہی حکیم صاحب کا رویہ اُس کے تئیں مشفقانہ وہمدردانہ رہا۔

وہ دوا پی کر جانے لگتا تو حکیم صاحب اِس کے بچوں اور بیوی کو صحت مند رہنے کے لئے دوائیں اور پھل دیتے۔آہستہ آہستہ حالاتِ حاضرہ ودیگر اُمور پر بھی باتیں ہونے لگیں۔حکیم صاحب حکیمانہ طور پر باتوں ہی باتوں میں اسلامی اعلیٰ قدروں اور بلند اخلاق باتوں کو بھی بتلانے لگے۔وہ حکیم صاحب کی مدبرانہ معلومات اور پھر ان کے عملی اسلامی رویہ اور مخلصانہ برتاؤ سے متاثر ہوتا گیا۔اب حکیم صاحب کو توفیق ہوئی تو انھوں نے اسلام سے متعلق کتابیں بھی پروفیسر کو مطالعہ کے لئے فراہم کیں۔اب وہ دیکھ رہا تھا کہ جسم پر جو گہرے سیاہ دھبے تھے وہ مدھم اور معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔اِس خوش گوار تبدیلی سے وِٹھل راؤ بہت خوش تھا۔آج اس کا آخری دن تھا' دھبّے غائب ہو گئے تھے۔وہ حکیم صاحب کے یہاں مؤدبانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا' کہنے لگا۔"حکیم صاحب آپ نے مجھے بدل کر رکھ دیا صرف جسم سے دھبّے ہی نہیں بلکہ میرے ذہن اور ضمیر میں جو تعصّبانہ اور تنگ نظری کے دھبّے تھے آج وہ بھی صاف ہو گئے ہیں۔میں اب تک کٹّر پسند تھا جو ایک مخصوص مذہب اور عقیدہ ہی کو ملک کے لئے اچھا سمجھتا اور اسی کی تعلیمات کی تلقین کرتا تھا۔اپنے ہی عقائد اور بے لچک خیالات اور فرقہ وارانہ ذہنیت کی عینک سے دوسرے مذاہب اور عقیدے والوں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔لیکن آپ کے اچھے اخلاق اور انسانیت بھرے برتاؤ سے میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔اب میرا ذہنی کینوس اتنا وسیع تر ہو گیا ہے کہ ہر مذہب' عقیدہ اور فرقہ کے لوگوں کی اچھائیاں نظر آ رہی ہیں۔اس کے اس لئے میں آپ کا احسان مند ہوں۔"

ارے پروفیسر صاحب مجھ میں جو بھی اچھائی ہے وہ میرے مذہب اسلام کی دین ہے۔ ہمارا دھرم ہم سے اچھے اور برتر اخلاق کے عملی مظاہرہ کی تلقین کرتا ہے۔ روزانہ میرے پاس ہر مذہب اور فرقہ کے مریض آتے ہیں اور میں ہر ایک سے یکساں اور اچھا سلوک کرتا ہوں۔ پروفیسر صاحب علاج میں کرتا ہوں اور اللہ شفاء دیتا ہے۔ اس لئے ہمارا ایمان ہے کہ اللہ شافی اللہ کافی۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں یہ حقیر فقیر آدمی آپ کو کیا سمجھائے گا۔ پھر بھی آپ خود دیکھئے کہ بنانے والے مالک نے اس ملک کو ایک چھوٹی سی دنیا جیسا بنایا ہے۔ اتنے مختلف مذاہب' فرقے' زبانیں' ذات پات کسی دوسرے ملک میں نہیں ہیں۔ آپ تو تاریخ کے استاد ہیں آپ بتلایئے کہ کیا سمراٹ اشوک کے دور میں ملک کے سارے باشندوں نے بُدھ مت کو قبول کرلیا تھا؟ کیا بادشاہ اورنگ زیب کا دور آنے تلک سارا ہندوستان مسلم ملک بن گیا تھا؟ قدرت نے اسے ہمہ مذہبی و کثیر لسانی ملک بنایا ہے۔ اور یہی اس کی ندرت اور خوبصورتی ہے۔ مشہور شاعر سرشار سیلانی جن کا اصلی نام بھیم سین تھا کیا خوب کہا ہے۔

چمن میں اختلاف رنگ و بو سے بات بنتی ہے
ہمیں ہم ہیں تو کیا ہم ہیں تمھیں تم ہو تو کیا تم ہو

واقعی حکیم صاحب اب تک میں ہندوستان کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار کو غیر جانبدارنہ انداز میں پیش کرتے ہوئے ہر قوم' مذہب اور فرقہ کی اچھائیوں اور اچھے کارناموں کو کشادہ ذہنی سے بتلاتا رہوں گا۔

اتنے میں حکیم صاحب کا ملازم گھبرایا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ شہر میں فساد ہو گیا ہے اور کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے۔ اس خبر سے پروفیسر وٹھل راؤ پریشان ہو گیا۔ حکیم صاحب نے اطمینان دلایا کہ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ اس نے اپنی بیوی کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اور اس کے بچے پڑوسی خان صاحب کے یہاں پناہ لئے ہوئے ہیں اور بالکل خیریت سے ہیں۔

حکیم صاحب میں نے خان صاحب کو غلط سمجھا تھا۔ حکیم صاحب نے کہا ''خان صاحب نے آپ کی بیوی اور بچوں کو اپنے یہاں پناہ دے کر ایک سچے مسلمان ہونے کا فرض ادا کیا ہے۔ ہمارے پیغمبر رحمت ؐ کا قول ہے کہ جس مسلمان سے اس کا پڑوسی ناخوش اور غیر محفوظ ہوگا تو قیامت کے دن اللہ اس کی عبادتوں کو اس کے منہ پر دے مارے گا۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس ملک کا ہر باشندہ دوسروں سے مل جُل کر رہے اور دکھ سکھ میں ساتھ دے تب ہی ہمارے ملک میں امن و چین ہوگا اور ملک ترقی کرے گا۔ شام تک پروفیسر حکیم صاحب کے یہاں بیٹھا رہا' ان کے اصرار پر وہ دہی سبزی دال روٹی کھائی۔ حکیم صاحب کو ملازموں کے ساتھ شانہ بشانہ نماز ادا کرتے دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ شام کو کرفیو ہٹنے کے بعد حکیم صاحب نے اپنے ملازم کو پروفیسر کے ہمراہ کوارٹر تک بھیج دیا۔ جب وہ اپنی سرکاری رہائش گاہ پہنچا تو دیکھا کہ اس کے بچے دونوں پڑوسیوں کے بچوں کے ساتھ مل کر مکان کے سامنے ریت سے ہندوستان کا نقشہ بنا رہے ہیں۔ ان کی بیوی خان صاحب اور دیوداس کی بیویوں اور بچیوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ یہ خوش گوار اور محبت بھرا منظر دیکھ کر پروفیسر وٹھل راؤ آنندراؤ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسی لمحے خان اور دیوداس باہر آئے۔ لپک کر وٹھل راؤ خان صاحب سے بغل گیر ہوا اور روتے ہوئے کہنے لگا ''بھائیو! مجھے معاف کرنا میں ہی غلطی پر تھا۔ اب آپ مجھ کو ایک نیا وٹھل راؤ پائیں گے جو ہر مذہب اور فرقے والوں کو اچھی نظروں سے دیکھے گا۔ سب کے ساتھ مل جُل کر رہے گا۔'' اس کے ساتھ ہی بچے ہندوستان کا نقشہ پورا بنا چکے تھے اور گا رہے تھے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اور بچوں کے ساتھ اس قومی نغمہ میں دیوداس اور خان صاحب کے ساتھ ساتھ وٹھل راؤ آنندراؤ کی جذبات سے بھری ہوئی آواز بھی شامل تھی۔

☆☆☆

منیر سیفی
Samanpura
BVC.Pana-800014
Mob-9835268274

قطعاتِ تاریخ

فرحت قادری

آپ کا دل تھا ہمشہ خونچکاں — صورتِ کشمیر فرحت قادری
بودھ دھرتی پر نہیں گونجے گا اب — نالۂ دلگیر فرحت قادری
جیتے جی ہی دیکھ لی تھی آپ نے — موت کی تصویر فرحت قادری
زندہ رکھے گی ہمیشہ آپ کو — آپ کی تحریر فرحت قادری
آپ کو رہتی تھی اردو کی سدا — فکر دامن گیر فرحت قادری
گفت ہاتف سالِ تاریخِ وفات — خلد کے رہگیر فرحت قادری

۱۴۳۸ھ

بیکلؔ اتساہی

عالمی شہرت یافتہ بیکلؔ اتساہی — موت سے لڑتے لڑتے جیون ہار گیا
نعت' بھجن' غزلوں' گیتوں کا شاعر وہ — ہے ہے یارو! آج سپردِ خاک ہوا
کہا فلک نے مصرعِ تاریخِ رحلت — صبحِ صادق تین ربیع الاول اور روز ہفتہ

۲۰۱۶ء مطابق ۱۴۳۸ھ

سید سعید رضا گوہر عظیم آبادی

پیکرِ مہر و وفا' حق آشنا' پابند شرع — شاہ کی اِملیٰ سے نکلا وصلِ حق کے واسطے
جو روایت کا امین اور جاں نشیں ثاقبؔ کا تھا — قیمتی وہ اک گہرؔ نکلا عظیم آباد سے

۲۰۱۶ء
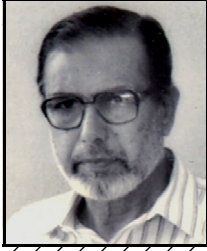
اقبال سلیم
No.97 AIWAN-E-TAHERA
4thMAIN,8thCROSS
J.H.B.C.S.LAYOUT
J.P.NAGER POST,
BANGALORE-560078

افسانہ

داستان اس حقیر کمترین کے عبرت پکڑنے اور روزہ رکھنے کی یوں ہے کہ ایک بار جو رمضان شریف تشریف لائے تو بقول بیگم کہ انھیں گویا الہام ہوا کہ وہ ہمارے دل پر چھائے ہوئے کفر و الحاد کے اندھیروں میں ایمان وتقویٰ کی شمع فروزاں کریں اور اس کی بسم اللہ اب کے رمضان کے پہلے روزے سے ہو۔ چنانچہ انھوں نے ایک رات ہمیں پاس بٹھا کر ہمارے آگے پہلے تو احادیث وروایات کے حوالوں سے پند ونصائح کے انبار لگائے پھر زبان میں شہد کا ایک پورا مٹکا اُنڈیل کر یوں سخن طراز ہوئیں ''اَلحَمدُ لِلّٰہ'' کل رمضان شریف کا پہلا روزہ ہے۔ ہم سب کے ساتھ آپ بھی روزہ رکھیں۔''

یہ سن کر ہمارے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے۔ ہم نے اپنا دفاع کرتے ہوئے صفائی پیش کی۔ ''دیکھئے آپ سمجھنے کی کوشش کریں ہم ٹھہرے دفتر کے آدمی۔ دن بھر بندھوا مزدور اور اس سے بھی زیادہ کولھو کے بیل کی طرح دن بھر محور پر گھومتے رہنے کے بعد شام کو گھر لوٹے تو آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے کے مصداق گھر کے مسائل میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ گھر میں شکر ختم ہوگئی منّے کی ناک صبح سے گنگا جمنا کے دھارے کی طرح بہہ رہی ہے، بڑی کی عقل داڑھ نکل رہی ہے۔ ڈاکٹر نے شام کو آنے کو کہا ہے۔ ہم اکیلی جان کریں تو کیا کریں۔ ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ آرام کس جانور کا نام ہے۔۔۔۔۔۔ دوسری طرف ہر آدھا گھنٹہ بعد ایک سگریٹ اور ہر دو گھنٹہ بعد ایک کپ چائے ہمارے حواس بچائے رکھنے کو ضروری ہے۔ اس صورت میں ہم ہر سال روزے نہ کھایا کریں تو ناچار کیا کریں۔۔۔۔''۔

تیوری چڑھا کر بولیں۔۔۔۔ ''غالبؔ کی بذلہ سنجی اور ظرافت تو اُن کے ساتھ ہی دفن ہوگئی جس کا جادو لوگوں کی نظروں سے اُن کی کمزوریاں غائب کر دیا کرتا تھا۔ اب آپ اُن کی نقل کر کے اپنا اُلّو سیدھا نہیں کر سکیں گے۔ کان کھول کر سُن لیں کہ آج رات کی سحری اور کل کا روزہ ضرور ہوگا''۔

''مگر آپ اُس کا کیا کریں گی کہ اس طرح ہماری میز پر فائلوں کا ڈھیر لگ جائے گا اور شام کو افطار کے لئے باس کی جھڑکیاں ساتھ لیتے آئیں تو تعجب نہیں۔'' اُنھوں نے اپنے ترکش سے دوسرا تیر چلایا ''ایک روزے ہی کی تو بات ہے اور پھر کل اتوار اور دفتر کی چھٹی ہے۔ یوں بھی تو دوستوں میں گپّیں ہانکنے سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ صوم وصلوٰۃ کی پابندی کے ذریعے آخرت کا کچھ توشہ ساتھ کر لیا جائے۔

ہم نے زیر لب یہ شعر پڑھا اور آنے والے طوفان سے لرزاں وپریشان ایک کرسی پر گر گئے۔

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا۔ کوئی آپ سے پوچھے تم نے کیا مزہ پایا؟

تو صاحب! اس طرح ہمارے پر کاٹ دیے گئے اور اس رات کوئی چار بجے کا عمل ہوگا اس طرح جھنجھوڑ کر خوابِ خرگوش سے جگائے گئے جیسے غیر متوقع طور پر قیامت نازل ہوگئی ہو۔ اگر چہ قیامت نازل نہیں ہوئی تھی مگر چال قیامت کی ضرور چل گئی تھیں۔ غنیمت تھا کہ انھوں نے عاقبت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔۔۔ سحری کے اہتمام میں ہماری پسند کا تھوڑا بہت خیال ضرور رکھا تھا۔ چنانچہ ہم نے خود بھی عاقبت اندیشی سے کام لیتے ہوئے نہ صرف شکم سیر ہوکر بلکہ ایک ممکنہ ''سوکھے'' کے پیش نظر احتیاطاً کچھ فالتو اسٹاک بھی اپنے گودامِ شکم میں محفوظ کر لیا۔

پھر پاس کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھ کر لوٹے اور کچھ دیر سو رہنے کا بیگم کا مشورہ نظر انداز کرتے ہوئے ایک صوفے پر گر کر تازہ اخبار سنبھال لیا اور کوئی نصف صفحہ پڑھ کر کمر سیدھی کی تھی کہ ہمارا ہاتھ لاشعوری طور پر تپائی کی طرف رینگ گیا۔ ہم نے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر منہ میں دبایا ہی تھا کہ قریب ہی ایک گوشے سے تسبیح خوانی میں مصروف بیگم کی آواز گونجی۔ ''توبہ توبہ۔۔۔۔ آج تو آپ کا روزہ ہے۔''

ہم نے فوراً سگریٹ رکھ دیا مگر بے قراریٔ دل کا یہ عالم تھا کہ اخبار کی ایک سطر پڑھ کر دوسری سطر تک آتے آتے پہلی سطر ذہن سے رفو چکّر ہو جاتی تھی۔ جب کچھ پلّے پڑتا نظر نہ آیا تو اخبار رکھ کر بیگم کی طرف دیکھا شاید وہ چائے لانا بھول گئی ہوں مگر فوراً ہی ہمارے اندر بیٹھے ہوئے سیکوریٹی گارڈ فرشتے نے ڈانٹ پلائی۔۔۔۔ ''شام تک کچھ نہیں ملے گا۔ آج تو تمھارا روزہ ہے۔ سر پیٹ کر ہم ٹیلی ویژن کی طرف متوجہ ہوئے ہی تھے کہ بیگم نے دوسرا گولہ داغا ''خوب! یہ روزہ دار کو شیطان کا صندوق ٹٹولنے کی کیا سوجھی ہے''!

چارو ناچار ہر طرف سے محاصرہ پا کر ہمیں بستر میں پناہ لینی پڑی۔ جب سو کر اٹھے تو دن چڑھ آیا تھا۔ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر برآمدے میں آبیٹھے اور اخبار کی سرخیاں دیکھنے لگے۔ کچھ دیر بعد بیگم بھی جاگ گئیں اور پاس آکر ہمارا چہرہ بغور پڑھتے ہوئے بولیں ''ہائے! منہ پر ابھی سے پھٹکار برسنے لگی۔ ابھی تو مشکل سے آدھا دن کٹا ہے۔ خیر اُٹھئے افطار کی تیاری کرنی ہے۔ دھوپ تیز ہونے سے پہلے

سوداسلف لے آئیں تو اچھا ہے۔ ورنہ پھول اور بھی مُرجھا جائے گا"۔

ہم نے ان کا طنزنظرانداز کر کے پڑے پڑے پوچھا "جو چاہے کہہ لیں مگر کیا پکانے کا ارادہ ہے؟"

"جو آپ مناسب سمجھیں مگر اتنا ضرور ذہن نشین کر لیں کہ کھانا بالکل سادہ ہو جو معدے میں جا کر دہشت گردی کو ہوا نہ دے یعنی مزاج دشمنان بگڑیں تو باقی روزوں کو بھی نہ لیں ڈوبیں"۔

ہمارے کان کھڑے ہو گئے۔ دم سادھ کر کہا "آپ نے بس ایک روزے کی بات کہی تھی، اب یہ باقی روزے کہاں سے ٹپک پڑے!" آن کی آن میں بات سے پھر جانا کوئی آپ سے سیکھے۔ یہ تو سراسر زیادتی اور وعدہ خلافی ہے بقول غالبؔ

دَر پہ رہنے کو کہا اور کہہ کر پھر گیا۔ جتنے میں مرا لپٹا ہوا بستر کُھلا

تو آپ کا مطلب ہے کہ ہمیں اگلے اُنتیس روزے بھی رکھنے ہوں گے۔ زچ ہو کر بولیں "بلا سے آپ روزے رکھیں یا نہ رکھیں مگر یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے خوشی اور امنگوں سے روزے رکھیں اور آپ جیسے تناور درخت کا روزے کے نام ہی سے گودا نکل جائے"۔

ہم نے بُرا مان کر کہا "یہ تو ہماری صاف توہین ہے۔ بچوں کے روزے کس شمار میں ہیں۔ ان کے لئے روزے کھیل تماشے سے زیادہ نہیں۔ معمول کے جیب خرچ کے علاوہ انھیں اس دوران خاطر خواہ روزہ الاؤنس بھی ملتا ہے۔ دوسری طرف روزے ان غازیوں کے لئے ڈھال سے کم نہیں جس سے اُن کا ہر طرف دفاع ہوتا ہے۔ یہ کل کے شریر لڑکے راتوں رات فرشتوں میں بدل جاتے ہیں۔ عام ہمدردیوں کا حصول بھی اُن کے روزوں کا محرک ہوتا ہے"۔

ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں "آپ بس باتیں ہی بنائیں گے یا کھانے کی فکر بھی کریں گے۔۔۔۔!"

ہم نے کہا "آپ بتائیں تو سہی۔۔۔۔۔!"

بولیں "سبزیاں گھر میں موجود ہیں۔ بس ذرا سا گوشت لا دیں تو بھون دوں"۔

ہم سودا سلف بازار سے لے کر لوٹے تو حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے تھے۔ جسم تھا کہ آگ کا گولہ ہوا جا رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کپڑوں سمیت ٹھنڈے پانی کے ٹب میں لیٹ جائیں۔ سودا بیگم کے ہاتھوں میں تھما کر کپڑے بدلے اور بستر پر گر کر اس طرح لیٹے جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے ہوں۔ عصر سے پہلے بیگم نے اس طرح جھنجھوڑ کر جگایا جیسے ابھی اسرائیل صور پھونکیں گے۔ ہم نے کسمسا کر احتجاج کیا۔ کچھ دیر اور سونے دیتیں تو قیامت نہ آ جاتی۔ کچھ تو روزہ دار کا خیال کرتیں۔" جواب میں ایک کھنکتا ہوا قہقہہ گونجا۔ پھر وہ ہماری چٹ پٹ بلائیں لے کر ایک ادا سے لہرا کر بولیں ؎

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

"اٹھئے نواب سعادت علی خاں ثانی صاحب۔ آپ روزے دار کے خیال کو کہتے ہیں۔ یہاں تو آپ کے خوابِ خرگوش کے روزے کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا۔ چلئے نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔"

غرض کافی بک جھک کے بعد ہم اٹھے اور مسجد میں نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہونے لگے تو بغل کے مکان سے آتی ہوئی گرم گرم سموسوں کی مہک نے ہماری رال ٹپکا دی۔ رواں رواں مچل اٹھا۔ آنتوں کا یہ حال کہ قل ھواللہ سے گزر کر قرآن شریف ختم کرنے پر تن گئی تھیں۔ جب صبر نہ ہو سکا تو بیگم کو آواز دی "اصول کی بات ہے کہ افطاری میں دو ایک چٹ پٹی چیزیں ہوں تو کیا کہنا۔

وہ چند لمحے ہمارے چہرے کے اُفق پر چھائے ہوئے دھندلکوں کا نظارہ کرنے کے بعد ترحم آمیز لہجے میں بولیں "آپ تزکیۂ نفس اور صبر و قناعت کا مفہوم سمجھنا چاہیں تو سمجھا دوں"۔

ہم نے ان کا طنز نظرانداز کر کے صفائی پیش کی "دیکھئے ہم نے تو ذرا مُنہ کا مزہ بدلنے کی بات کہی تھی اور آپ کو صبر و نفس کا فلسفہ یاد آ گیا۔ واہ صاحب! ہمسائے سموسے کھائیں اور ہم اپنی رالیں پونچھیں۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ گھر گھر دیوالی اور ہمارے گھر میں اندھیرا ہو۔ یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ کیوں نہ ہم بھی بازار سے چند سموسے لے آئیں۔ اب گھر میں تیار کرنے کا وقت نہ رہا۔ روزے اور سموسے کا رشتہ تو بہت پُرانا اور چولی دامن کا رشتہ ہے۔ سموسے کے بغیر افطار کی رونق کا تصور ہی غلط ہے"۔

یہ سُن کر ہمارے دونوں بچے ہنسنے لگے۔ وہ جیسے جان چھڑانے کو بولیں "توبہ توبہ۔۔۔۔ حد ہو گئی چٹور پن کی۔۔۔۔ خیر جا کر لے آئیں"۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ۔ ہم اُٹھے اور نالہ روز کے دل خوش سموسہ کارنر سے تیس روپے کے بارہ عدد سموسے لے آئے۔

دسترخوان چنا گیا۔ اُدھر مغرب کی اذان ہوئی اِدھر ہماری بھی بسم اللہ ہو گئی۔ بیگم اور بچوں نے ایک ایک سموسے کھا کر ہاتھ روک لیا مگر یہاں تو بھوک سے روح فنا ہو رہی تھی اور پیٹ میں آنتوں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔ کھاؤ۔۔۔۔۔۔۔ اور کھاؤ۔۔۔۔۔۔ چنانچہ ہم نے باقی نو عدد سموسے مالِ غنیمت جان کر ایک ایک کر کے معدے میں اُتار دئے۔ روٹیاں اور تھوڑا سا کھانا بھی کھا لیا اوپر کچھ میوے اور پھل کی بھی تہہ جمائی اور دو تین گلاس پانی بھی چڑھا لیا۔ اب جو اُٹھنا چاہا تو اُٹھا نہ گیا ناچار بجائے مسجد کا رُخ کرنے کے بیڈروم میں جا کر پڑے رہے۔ اس طرح ہمارا پہلا روزہ تمام ہوا۔

گھنٹہ بھر بعد بیگم کے آسمان سر پر اُٹھا لینے پر بہ دِقّت تمام مسجد میں عشاء کی نماز پڑھ آئے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اس طرح سوئے کہ آدھی رات سے ذرا پہلے ہی جاگے۔ آدھی رات کے بعد کسی زلزلے کی گڑگڑاہٹ نے ہماری نیند اُڑا دی۔ آواز کہیں اور سے نہیں خود ہمارے معدے سے آ رہی تھی۔ پھر جو دستوں کا سلسلہ

(بقیہ صفحہ 54 پر)

افسانہ

صابر ادیب
۵۳/گل کدہ، نزد پکی مسجد۔ شاہجہان آباد بھوپال-462001
Mob:9303128330

کہانی ایک قلم کار کی

کہتے ہیں۔۔۔ دنیا سے شرافت اٹھ گئی۔ اس کسمپرسی اور بدحالی کے دور میں انسانیت نے دم توڑ دیا۔ اور جو لوگ اس زمانہ میں شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اُنھیں دنیا احمق سمجھتی ہے۔ اس دور کا سب سے بڑا بے وقوف انسان کہتی ہے۔

میں کئی دن سے پریشان تھا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے پیٹ بھرنے کے لئے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور نہ ہی اس لئے کہ اگر میں نے مالکِ مکان کو تین ماہ کا کرایہ جو مجھے دینا تھا نہ دیا تو میرا سارا سامان مکان کے باہر پھینک دے گا۔ بلکہ اس لئے کہ مدیر ماہنامہ ''زندگی'' کا تقاضا اب شدّت اختیار کر چکا تھا۔ اُن کا سالنامہ نکلنے والا تھا اور اس کے لئے مدیر محترم نے مجھ سے ایک کہانی بھیجنے کی فرمائش کی تھی۔ میں جانتا تھا کے مجھے میری دماغ سوزی کا صلہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔ پھر بھی میں ان کی بات ٹال نہیں سکا۔ کیونکہ وہ بڑے محنتی انسان تھے اور اُن کے اسی خلوص نے مجھے اُن کا گرویدہ بنا لیا تھا۔ یہاں دماغ سوزی کے صلہ سے میری مراد میرے قلم کی مزدوری ہے۔ میرے فن کی قیمت ہے جو مجھے میری کہانیوں کے بدلے روپیوں کی شکل میں ملتی ہے۔ زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے مجھے اپنے فن کا سودا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ یہی آج کے فن کار کے فن کی معراج ہے۔!

میں صبح سے شام تک اپنی کھٹارہ سائیکل پر سوار کسی کہانی کی تلاش میں سارے شہر کا چکر لگاتا پھرتا۔ لیکن کہانی بھی کسی وعدہ فراموش حسینہ کی طرح کہیں نظر نہ آئی۔ کبھی کبھی قدرت بھی انسان کے ساتھ بڑا خوب صورت مذاق کرتی ہے۔ جب وہ موت مانگتا ہے تو اسے زندگی ملتی ہے اور جب زندگی مانگتا ہے تو موت اسے گلے لگانے کو بے قرار نظر آتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آ کر ربِّ کائنات کی شانِ ربوبیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

میں بہت مایوس ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مدیر ''زندگی'' سے معذرت چاہ لوں۔ اس لئے نہیں کہ میں انھیں مفت میں کہانی نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ کہانی مفت میں تیار نہیں ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کہانی مفت میں تیار نہیں ہوتی۔! موڈ بنانے کے لئے سگریٹ کے مرغولوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذہن کو تقویت بخشنے کے لئے کافی اور چائے کی حاجت ہوتی ہے۔ اور اس وقت میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

میں سوچتا رہا اور سوچتا رہا لیکن جب ذہن نے بنا اپنی خوراک لئے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو میں نے لیٹر پیڈ سے ایک کاغذ نکالا اور مدیر 'زندگی' سے معذرت کے طور پر چند جملے لکھ کر اسے بند کر دیا۔ پھر مجھے خیال آیا اسے بھیجنے کے لئے لفافہ چاہیے اور لفافہ حاصل کرنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے' اور پیسے فی الحال میرے پاس نہیں ہیں۔ پھر کیا کرنا چاہئے' یہ مسئلہ حل کرنے کے لئے میں نے پھر اپنے ذہن کا سہارا لیا اور اس مرتبہ ذہن نے میرا ساتھ دیا۔ اور اس کا حل ڈھونڈ نکالا۔ میں نے فوراً کاغذ کا ایک لفافہ بنایا' پرچہ کو اس کے اندر رکھا اور لفافہ بند کر کے اس کے اوپر ''بیرنگ'' لکھ دیا۔ اس کام کو انجام دینے کے بعد مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میرے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا اور پھر میں نے سکون و اطمینان کی ایک لمبی سانس لی۔

ڈاک نکلنے کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے لفافہ اٹھایا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ دروازہ بند کرنے کے لئے جیسے ہی میں نے کواڑ کو زور سے کھینچا' کیونکہ دروازہ ذرا سختی سے بند ہوتا تھا۔۔۔ کہ اچانک کوئی چیز اوپر سے میرے سامنے آ گری۔ میں نے بڑھ کر اسے اٹھا لیا۔ یہ دس روپے کا سکہ تھا۔ مجھے پھر قدرت کا قائل ہونا پڑا۔ وہ کہتے ہیں نہ ''قدرت جب کسی کو دیتی ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتی ہے'' اور اس وقت یہ دس روپے کا سکہ یقیناً چھپر پھاڑ کر ہی گھر پہنچا تھا۔ میرے ہونٹ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب اس لفافہ میں نہیں بھیجنا چاہئے۔ چل کر کسی شناسا کے ہوٹل سے ایک پیالی چائے پینا چاہیے اور کچھ سگریٹ خرید لینا چاہیے۔ یہ طے کر کے میں نے پھر دروازہ کھولا' اپنی کھٹارا سائیکل نکالی' کمرہ بند کیا اور اس کھٹارا سائیکل پر سوار ہو کر ایک شان بے نیازی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

یہ میری سائیکل بھی خوب ہے۔ پندرہ سال سے میرا ساتھ دے رہی ہے۔ کھٹارا تو اسے میں پیار سے کہتا ہوں۔ اگر آپ اسے دیکھیں گے تو نئی سمجھیں گے۔ کیونکہ میں نے اس پر رنگ و روغن کرا لیا ہے۔ اس دور میں انھیں کو عزت و توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جن کے پاس نمود ہے' ظاہر داری ہے' اندر کتنی ہی سیاہی کیوں نہ ہو اوپر سفیدی ہے۔ میری سائیکل بھی اس دور کی تلخ حقیقت ہے۔ یہ ظاہری طور پر جتنی تندرست و توانا ہے اتنی ہی اندرونی طور پر کمزور و ناتواں ہے۔ اس لئے میں اسے کھٹارا کہتا ہوں۔ آیئے اس سلسلہ میں ایک واقعہ سناتا چلوں۔۔۔

ایک دن ایک ناکام شاعر نے بحرۂ کیسپین سے ایک سنہری مچھلی پکڑی۔ مچھلی نے بڑی لجاجت سے کہا ''شاعر۔۔۔ شاعر مجھے سمندر میں واپس ڈال دو''

''تم مجھے اس کا کیا صلہ دو گی''؟ شاعر بولا۔

''میں اس کے عوض تمھاری ساری خواہشیں پوری کردوں گی'' مچھلی نے جواب دیا۔

شاعر بہت خوش ہوا۔اس نے مچھلی کو سمندر میں چھوڑ دیا۔پھر کیا تھا نت نئی کامیابیاں اس کے قدم چومنے لگیں۔اس کے مجموعے دھڑا دھڑ چھپنے لگے۔اسے ادبی کارناموں کے لئے اعزازات سے نوازا جانے لگا۔شہرت اس قدر حاصل ہوئی کہ ہر شخص کے لب پر اسی کے تذکرے تھے۔زندگی گونا گوں کامیابیوں سے ہمکنار تھی کہ ایک دن اس کی بیوی نے باتوں باتوں میں کہا ''یہ تو سب ٹھیک ہے' جو آپ چاہتے تھے وہ سب آپ کو مل گیا ہے لیکن اس میں آپ کا اپنا کیا ہے؟۔جانِ من ایک بات کہوں ''جب تمھیں اتنا موقع ملا تھا' تو سنہری مچھلی سے تھوڑی سی صلاحیت کیوں نہ مانگ لی۔کوّا مور کے پر لگا کر کب تک مور بنا رہ سکتا ہے۔''

تب شاعر کو محسوس ہوا۔۔۔۔وہ ظاہر میں جو کچھ ہے۔۔۔۔حقیقت میں کچھ نہیں ہے۔

اس میں مور بننے کی صلاحیت کی کمی ہے۔وہ کوّا ہے کوّا ہی رہے گا۔تو میری سائیکل بھی اسی مور نما کوّے کی مصداق ہے۔ابھی میں کچھ دور ہی گیا تھا کہ اچانک سائیکل کی چین اُتر گئی۔میں سائیکل سے اُتر پڑا۔اور میں نے چین چڑھانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔سامنے ہی ایک سائیکل کی دوکان تھی۔میں نے اسے اپنی سائیکل دکھائی اور اپنی پریشانی بتائی۔چند لمحوں کی محنت کے بعد سائیکل درست ہوگئی۔اس دوران میری نظر دوکان کے سائن بورڈ پر گئی۔''شمیم سائیکل ورکس'' اور تب ہی میرا ہاتھ پتلون کی جیب میں گیا۔اور وہی دس روپے کا سکہ میرے ہاتھ میں آگیا۔میں نے روپے نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

میری عادت ہے کہ میں ہمیشہ محنت کش کو اس کی محنت کا پورا پورا صلہ دینے کی کوشش کرتا ہوں۔حالانکہ میں خود اس معاملہ میں بدقسمت رہا۔اپنی محنت کے طور پر اس نے پانچ روپے رکھ لئے تھے۔اور پانچ روپے مجھے واپس کردئے تھے۔

میں نے سوچا اس کی محنت تین روپے کی بھی نہیں تھی۔پھر بھی اس نے پانچ روپے لے لئے۔میری نظر پھر دوکان کے سائن بورڈ پر گئی۔میں کچھ مطمئن سا ہوگیا شاید اسے اتنی ہی کی ضرورت ہوگی۔میں نے روپے جیب میں رکھ لئے۔سائیکل سنبھالی اور چلنے کے لئے مُڑا ہی تھا کہ اچانک میری نظر دوکان پر گئی۔وہ پاس والے دوکان سے اشاروں کنایوں میں کچھ کہہ رہا تھا۔اور ان اشاروں کنایوں سے مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اپنی لیاقت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے میری حماقت کی داستان بیان کر رہا تھا' کہ اس نے کس طرح بیوقوف بنا کر مجھ سے زیادہ رقم اینٹھ لی ہے۔

میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ایک کہانی مل گئی' پانچ روپے میں کہانی۔!اور میں نے کہانی ملنے کے نشے میں جھومتے ہوئے پیڈل پر پیر مارا۔اور سائیکل آگے بڑھ گئی۔☆☆☆

(ہزاری روزہ کا بقیہ)

چل پڑا تو سارے سموسے ایک ایک کر کے معدے کی قید سے آزاد ہوگئے۔

بیگم سر پیٹ رہی تھیں۔''وہ آدمی ہی کیا جس کو صبر نہ ہو۔حد ہوگئی چٹور پن کی۔ندیدی بلی کی طرح ماٹی ملے ملاوٹی تیل میں بنے ان سموسوں پر ٹوٹ پڑنے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ایک نہ دو پورے نو سموسے۔۔۔۔غضب خدا کا۔۔۔۔''

شکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا گھر قریب ہی تھا۔انھوں نے بروقت دوا دے کر گویا ہمیں قبر سے کھینچ نکالا۔جان بچی لاکھوں پائے۔حق تو یہ ہے کہ ان نو سموسوں کے طفیل ہمارے اُنتیس روزے بخش دیے گئے یعنی یہ ہماری خوش فہمی تھی کہ بیگم نے احتیاطاً ہمیں مزید روزے رکھنے سے منع کر دیا۔مگر قصہ یہیں پر ختم نہیں ہوا' ہم دوا کھا کر سوئے تھے کسی وقت آنکھ کھل گئی۔بیگم بچوں کے ساتھ غالباً سحری کے اہتمام میں مصروف تھیں۔دفعتاً ہمارے چھوٹے صاحبزادے کی آواز سنائی دی ۔۔۔۔ممّی! کیا ابّا روزہ نہیں رکھیں گے۔۔۔۔؟

تم نے دیکھا نہیں ۔۔۔۔۔بیگم کی بجھی بجھی آواز آئی۔''طبیعت خراب کر لی ہے ویسے بھی روزے کے نام سے انھیں ہول آتا ہے۔''

''ابّا کو بازار کی چیزیں کھانے کی کیا سوجھی تھی؟''

یہ بڑے صاحبزادے کی آواز تھی۔''گھر کا پکا کھا لیتے کل ہماری ٹیچر کہہ رہیں تھی کہ روزے رکھو اور ہمیشہ سادہ کھانا کھاؤ۔ہمارے رسولؐ تو اکثر صرف چند کھجوروں پر سحری اور افطاری کر لیا کرتے تھے۔ہم بھی سادہ کھانا کھائیں گے۔تا کہ بازار کی چیزیں کھا کر طبیعت خراب نہ ہو اور روزے بھی ناغہ نہ ہوں۔''

یہ ایک جملہ نہ تھا ایک طمانچہ تھا جو اس سات برس کے معصوم بچے نے نادانستگی میں ہمارے منہ پر مارا تھا۔یہ سراسر ہمارے لئے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ضمیر نے لتاڑا تو کمبل پھینک کر اُن میں جا شامل ہوئے۔

''ہم بھی روزے رکھیں گے۔۔۔۔ہم نے پورے عزم و اعتماد کے ساتھ کہا۔انشااللہ پورے روزے رکھیں گے۔خواہ کھانے میں ہمیں چند کھجوریں ہی کیوں نہ ملیں۔''

ایک سناٹا چھا گیا۔۔۔۔سب حیرت سے ہمارا منہ تک رہے تھے۔جب انھیں یقین ہوگیا کہ دستوں کی کثرت سے ہمارا دماغ چل نہیں گیا ہے اور ہم پورے ہوش و حواس میں ہیں۔تو بیگم کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی۔

''اللہ کا شکر ہے۔۔۔۔۔'' اُن کی آواز بھرائی ہوئی تھی کسی کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعائیں کبھی بے اثر نہیں جاتیں۔'' آیئے تشریف لایئے''۔

اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے پورے روزے رکھ کر اب تک کے اپنے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔☆☆☆

منظور وقار
Near Stalen School,
Yadhalla Colony,
GULBARGA-585104(K.S)

افسانہ

مجرب نسخہ

احمد شکیل نے جب فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد تلاوت قرآن پاک کر کے سینے پر پھونک ماری تو اسے اپنا بدن ہلکا پھلکا مہکتے ہوئے پھول کی طرح لگا۔ مقدس آیات کی تلاوت نے اس کے پورے وجود میں تقدس اور پاکیزگی کی لہرسی دوڑا دی تھی۔ جب وہ مسجد سے مکان پہنچا تو اس کی بیوی رشیدہ کچن میں ناشتہ تیار کر رہی تھی اوراس کے دونوں بچے دادا جان کے ساتھ نرسری اسکول جانے کے لئے مکان سے باہر نکل رہے تھے۔ ریڈیو پر ''دینی پروگرام'' کے تحت ملک کے ایک ممتاز عالم دین کا وعظ نشر ہو رہا تھا۔ مولانا کی گرجدار آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ وہ آرام کرسی میں پھیل کر بیٹھ گیا۔ دل ودماغ کو مولانا کے وعظ کی جانب مرکوز کر دیا۔ مولانا خیالات کی پاکیزگی اور نفسیاتی خواہشات پر قابو کے موضوع پر وعظ کر رہے تھے۔ مولانا کا وعظ قرآنی آیات کا ترجمہ اور احادیث کے حوالوں سے پُر تھا۔ وعظ کے آخر میں مولانا نے مسلمانوں کو انتباہ کرتے ہوئے دھاڑا۔۔۔۔۔

''مسلمانو! ہمیشہ اپنی نظروں کو نیچے رکھو اور خیالات کو پاکیزہ ورنہ مرنے کے بعد تمھارے جسم جہنم کی آگ میں سوکھی لکڑیوں کی طرح جلتے رہیں گے''۔ احمد شکیل مولانا کے اس آخری جملے پر کانپ گیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں۔ آنکھوں کے آگے جہنم کی آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اسے اپنا بدن جہنم کی آگ میں دھائیں دھائیں جلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کیونکہ وہ ادھر چند ماہ سے ایک بہت ہی شرمناک مرض میں مبتلا تھا۔ وہ جب بھی خوبصورت لڑکیوں اور گدرائے بدن کو دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ نہ صرف انھیں یک ٹک تکنے لگتا تھا بلکہ نظروں ہی نظروں میں انھیں برہنہ کرنے لگتا تھا۔ احمد شکیل سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ وہ اپنے دفتر میں ایماندار اور محنتی نوجوان کہلاتا تھا۔ وہ بدچلن اور اوباش قسم کے لوگوں کی صحبت اور ۔۔۔فلم' ادب' سیاست' لڑائی جھگڑا' کھیل تماشوں سے دور گھر دفتر اور دوستوں میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے والا ایک انتہائی سیدھا سادا اور سنجیدہ مزاج نوجوان تھا۔ اسے نہ شراب پینے کی لت تھی اور نہ طوائفوں کے کوٹھوں پر جانے کی عادت' حتیٰ کے وہ سگریٹ بیڑی اور فلم بینی کا بھی عادی نہیں تھا۔ ایک خوبصورت بیوی اور دو چھوٹے چھوٹے معصوم لڑکوں کا باپ ہونے کے باوجود نظروں ہی نظروں میں خوبصورت لڑکیوں اور گدرائے بدن ۔۔۔۔۔ کو برہنہ کرنے کے مرض میں مبتلا تھا۔ وہ اپنے مرض کے تعلق سے سوچتا (شاید میری آنکھوں میں جنسی آگ ضرورت سے کچھ زیادہ سلگنے لگی ہے۔ اور یہی آگ نوجوان لڑکیوں اور گدرائے بدن پر موجود کپڑوں کو جلا ڈالتی ہے۔۔۔۔۔ کبھی ہوا اپنی نظروں کو نیچی رکھوں گا اور خیالات کو پاکیزہ) وہ مولانا کے آخری جملے کو بار بار یاد کرنے لگا۔ حسب معمول صبح دس بجے آفس جانے کے لئے مکان سے باہر نکلا اور تیز تیز قدموں سے آفس کی جانب بڑھنے لگا۔ راستے میں اسے ہنستی مسکراتی بل کھاتی ہوئی چکنے بدن اور سرخ سرخ گالوں والی کالج کی لڑکیوں کا ایک غول گزرتا ہوا نظر آیا۔ وہ لڑکیوں کے اس غول کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظریں لڑکیوں کے جوان جسموں پر جیسے کھپ کر رہ گئیں اور پھر اس کی نظروں میں لڑکیاں کپڑوں سے بے نیاز ہوتی گئیں۔ اسے ایک جھرجھری سی آئی اور اس نے لڑکیوں کے جسموں سے نظریں ہٹا کر اپنے گالوں کو دونوں ہاتھوں سے ۔۔۔۔ تھپتھپاتے ہوئے توبہ توبہ کی اور مولانا کے آخری جملے کو یاد کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ جب وہ آفس کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا بڑ کے پُرانے درخت کے نیچے ایک کتا اور کتیا آپس میں محو اختلاط ہیں ''تھو تھو توبہ توبہ'' وہ بڑبڑانے لگا۔ ''اس طرح کے گندے مناظر کیا میری نظروں کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ۔۔۔۔۔۔۔ لپک کر آفس میں گھس پڑا۔ اور کرسی میں دھنس کر فائلوں کی دنیا میں کھو گیا۔

''آپ کے پیپر تیار ہیں سر'' ایک مترنم آواز نے اس کے کانوں میں رس گھولا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے آفس کی نئے ٹائپسٹ شیلا جو ایک بھرے بھرے جسم کی خوبصورت عورت تھی کھڑے پایا۔ احمد شکیل کی نظریں شیلا کے بھرے بھرے جسم میں دھنس کر رہ گئیں اور پھر اس کی نظریں شیلا کے جسم پر موجود پولسٹر کی خوش رنگ ساڑی اتارنے لگیں۔ احمد شکیل کو ایک ٹک تکتے ہوئے دیکھ کر شیلا سٹپٹا گئی اور قدرے تیز آواز میں بولی ''کیا ہوا سر''؟ کہاں کھو گئے؟؟'' احمد شکیل ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولے'' کوئی خاص بات نہیں شیلا'' شیلا ان پر مشکوک نظر ڈالتے ہوئے اپنی جگہ چلی گئی۔۔۔۔ احمد شکیل نے بات ٹال تو دی مگر اس کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ شیلا نے اس کی گندی حرکت کو تاڑ لیا ہے۔ ''عورت کی حس واقعی بڑی تیز ہوتی ہے'' وہ اندر ہی اندر تلملا کر رہ گیا۔ شیلا جانے کے بعد وہ اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ کر کرسی میں دھنس گیا اور ایک ٹھنڈی سانس چھوڑ کر بالوں کے بیچ انگلیاں دوڑاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''آخر یہ کیسا مرض ہے۔ کیا میری زندگی کے قیمتی لمحات جوان لڑکیوں اور خوبصورت عورتوں کے جسموں کو تکتے تکتے اور انھیں نظروں ہی نظروں میں برہنہ کرتے ہوئے ہی کٹ جائیں گے۔ شاید میں نفسیاتی مریض ہوں''۔ اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی ماہر نفسیات سے رجوع ہوگا اور اس واہیات مرض سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ شام ساڑھے پانچ بجے وہ آفس سے باہر نکلا بارش تھم چکی تھی' آسمان پر بادل چھٹ چکے تھے۔ ہلکی ہلکی دھوپ

اونچی اونچی عمارتوں اور چکنی چکنی سڑکوں کو سنہرا رنگ دے رہی تھی۔ پھول اور پتیوں سے لدے ہوئے گل مہر کے پیڑوں پر خوش رنگ پرندے موج میں آکر چہک رہے تھے۔ چونچ سے چونچ ٹکرا کر ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔

گیلی سڑک پر کالج کے لڑکے لڑکیاں اور آفس سے لوٹتے ہوئے لوگ اپنے اپنے مکان پہنچنے کی پاگل دوڑ میں مصروف تھے۔ احمد شکیل تیز تیز چلتے ہوئے شہر کے مصروف و معروف ماہر نفسیات ڈاکٹر راجن کے کلینک پر پہنچا۔ کلینک میں بہت سے مرد عورتیں اور جوان اپنا اپنا مرض ڈاکٹر کو بتانے کے لئے پہلے سے موجود تھے۔ احمد شکیل ان مریضوں کے ساتھ کیو میں بیٹھ گیا۔ جب اس کا نمبر آیا تو وہ بجلی کی سی تیزی سے ڈاکٹر راجن کے (Consulting Room) روم میں داخل ہو گیا اور اپنی پریشانی ڈاکٹر راجن کو بتلا کر بولا ''ڈاکٹر صاحب! جلد سے جلد مجھے اس مرض سے چھٹکارا پانے کا راستہ بتادو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

احمد شکیل کی باتیں غور سے سننے کے بعد ڈاکٹر راجن نے پوچھا ''مسٹر! کیا آپ کی بیوی خوبصورت نہیں ہے؟'' احمد شکیل نے جواب دیا ''بہت خوبصورت ہے ''ڈاکٹر راجن نے دوسرا سوال کیا ''پھر تو تمھاری بیوی بیمار ہوگی؟؟'' ''میری بیوی تندرست اور توانا جسم کی مالک ہے۔'' ڈاکٹر راجن جھنجھلا گیا اور اس نے تیسرا سوال کیا ''شاید جنسی ملاپ کے وقت تمھاری بیوی تمھارے ساتھ تعاون نہیں کرتی ہوگی''۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں ڈاکٹر! ہماری ازدواجی زندگی نہایت خوشگوار ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دو خوبصورت لڑکوں کا باپ ہوں۔

احمد شکیل کا جواب سن کر راجن کی جھنجھلاہٹ حیرانی میں بدل گئی۔ اسے خود بھی احمد شکیل کا علاج مشکل نظر آنے لگا۔ اچانک ایک خیال ڈاکٹر راجن کے دماغ میں بجلی کی طرح لپکا' وہ چہکتے ہوئے احمد شکیل سے کہنے لگا ''مسٹر! تمھاری بیماری کا آسان علاج میری سمجھ میں آگیا ہے۔'' احمد شکیل نے خوش ہو کر پوچھا ''جلد بتاؤ ڈاکٹر مجھے کیا کرنا ہے؟'' ڈاکٹر راجن احمد شکیل کو سمجھانے لگا ''جب بھی تمھاری نظریں خوبصورت لڑکیوں اور بھرے بھرے جسم والی عورت پر پڑے تم انھیں اپنی بہنیں تصور کرنا۔ خود بخود تمھاری آنکھوں میں احترام اور تمھارے خیالات میں پاکیزگی اُمنڈ آئے گی۔'' ڈاکٹر راجن کا مشورہ سننے کے بعد احمد شکیل خوشی سے اچھل پڑا ڈاکٹر راجن کا مشورہ ''مجرب نسخہ'' معلوم ہونے لگا۔ وہ خوشی خوشی کلینک سے باہر نکلا اور جھومتا ہوا مکان پہنچا۔ اس رات وہ بہت خوش تھا' اس کی غیر معمولی خوشی کو دیکھ کر اس کی بیوی رشیدہ نے پوچھا۔ ''آج بہت زیادہ خوش نظر آرہے ہو شکیل! کیا بات ہے کہیں تمھارے پرموشن کا آرڈر تو نہیں آگیا''؟ وہ رشیدہ کی تشویش انگیز مسرت کو ٹال گیا۔ اس کی خوشی کے پس پردہ جو راز پوشیدہ تھا اس راز سے صرف وہ خود ہی واقف رہنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ذہنی کیفیت اور اپنی نظروں کی گندی حرکتوں کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہ اپنے اس شرمناک مرض سے کسی کو واقف کرانا چاہتا تھا۔ دوسرے دن صبح نہا دھو کر ناشتہ کرنے کے بعد احمد شکیل چھتری لے کر آفس جانے کے لئے مکان سے نکلا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ اس نے چند فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ راستے میں اس کے آفس کا ساتھی رمیش مل گیا۔ بوندا باندی میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ بارش سے بچنے کے لئے رمیش دوڑ کر احمد شکیل کی چھتری کے نیچے آگیا۔ دونوں آفس کے Pending Work اور نئے آفیسر کے مزاج کے تعلق سے باتیں کرتے ہوئے تارکول کی گیلی سڑک پر تیز تیز چلنے لگے۔

اچانک احمد شکیل راستے میں رُک گیا اور اور سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے رمیش سے کہنے لگا ''وہ جو سامنے گیلے کپڑوں میں کسے ہوئے خوبصورت بدن اور سرخ سرخ گالوں والی لڑکیاں گزر رہی ہیں' وہ لڑکیاں ہو بہو میری بہنوں کی طرح لگ رہی ہیں۔'' احمد شکیل کے اس جملے کو سن کر رمیش نے اس کی جانب حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا ''کیا کہہ رہے ہو شکیل! گیلے کپڑوں میں ملبوس لڑکیاں!! کہاں ہیں لڑکیا؟؟ سامنے تو سڑک خالی ہے۔ احمد شکیل رمیش کے ان حیرت انگیز سوالات کو سن کر ٹھٹک گیا۔ ان چند لمحوں میں اس کا بدن پسینے میں ڈوب گیا۔ وہ آنکھیں مل مل کر پاگلوں کی طرح سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ سڑک تو واقعی خالی تھی' لڑکیوں کا تو دور دور تک نام و نشان تک نہیں تھا۔ اور۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ اسے لگا اس کا دماغ بارود کے ایک زبردست دھماکے کی وجہ سے پھٹ کر چاروں طرف بکھر چکا ہے۔ ☆☆☆

افسانچے

ایم۔اے۔احد
73,Satyanaga.Bhubaneswar,
751007

ابّو بنام پاپا

ایک سگار سلگاتے ہوئے اپنے اندر تھوڑی ہمت پیدا کر کے سہمے ہوئے لہجہ میں فرید جعفری نے اپنی بیوی سے کہا''ڈارلنگ'حمیدہ کا فون آیا تھا۔ابو کی طبیعت ناساز ہے ۔کڈنی کا پرابلم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

''تو پھر''نشاط فریدی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''میری خواہش ہے کہ علاج کے لئے ابو کو دہلی بلالوں''

''ارے اس میں فکر کس بات کی ہے؟''بڑی خوش دلی سے نشاط نے جواب دیتے ہوئے مزید کہا''آپ اتنا پریشان کیوں ہیں۔کڈنی کا مرض معمولی ہے۔حیدرآباد میں ہی اس کا علاج ہوسکتا ہے۔آپ فوراً پچاس ہزار روپے حمید کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردیں'اور اسے مطلع کردیں۔بس اتنی سی بات ہے۔

''ہاں!ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ''۔

ہفتہ بھر بعد جوڑا کھولے بالوں کو شانوں پر ڈالے نشاط فریدی نہایت ہی رومانٹک انداز میں اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی''جانو'آپ کو پتہ نہیں ممی نے فون پر بتایا کہ مارننگ واک سے لوٹتے وقت اوبڑ کھابڑ جگہ پر پیر گر جانے کی وجہ سے پاپا کا لفٹ اینگل پر اسپرین ہوگیا ہے۔سخت درد ہے۔''

''گھبرانے کی کیا بات ہے معمولی چوٹ ہے''۔

''آپ معمولی کہہ رہے ہو۔حیدرآباد کے ڈاکٹروں پر میرا بھروسہ نہیں۔مجھے شک ہے اسپرین نہیں ہوگیا ہوگا۔ہیئر لائن فیکچر ہوگیا ہوگا۔۔۔۔۔۔آپ ذرا ڈاکٹر اگروال سے اپائنمنٹ لے لیں۔میں کل پاپا کو آجانے کے لئے کہہ دوں''۔

''ہاضرور ضرور،میں ابھی کل صبح کی فلائٹ میں دو ٹکٹیں بک کرادیتا ہوں''۔

☆☆☆

ساحر کلیم
IndiaGasWorks.Sillod-431112
Aurangabad

افسانچے

نیم پلیٹ

اُس نے اپنے نئے کرائے کے مکان کے لئے دو نیم پلیٹ بنوائیں۔ایک پر اپنا اصلی نام جرّار احمد صدیقی اور دوسری پر ٹھاکر پرتاپ سنگھ۔!بیوی اور بچوں کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اُس نے کہا:''یہ دوسری نیم پلیٹ ہمیں فسادات کے موسم میں کام دیں گے!۔!!''

وَصِّیت

حضرت طرفہ قریشی نے وصیت کی''اُن کے انتقال کے بعد اُن کی ذاتی لائبریری کی کتابیں نہ جلائے جائیں'نہ ردّی والے کو بیچی جائیں'بلکہ ذی علم حضرات میں مُفت تقسیم کردیے جائیں۔!''انتقال کے بعد ذی عِلم حضرات سے رابطہ قائم کیا گیا تو پتہ چلا کہ اُن لوگوں نے بھی ایسی ہی وصیت کر رکھی ہے۔!۔!!

بُری عورت

''ارے اُس عورت کو باجی !باجی!! کیوں کہہ رہے ہو؟وہ اچھی عورت نہیں ہے۔!''

''تو کیا بُری عورت کے بھائی نہیں ہوتے؟''

حقارت

''وہ بسکٹ کا ڈبّا کتنے کا ہے؟''

سیلس گرل نے خستہ حال گاہک کو حقارت سے دیکھ کر کہا!

''وہ تمھارے کام کا نہیں ہے۔تم یہ پارلے جی لے جاؤ۔!!''

''کیوں؟وہ کیوں نہیں؟''

''کیونکہ وہ کُتّے کے کھانے کے برانڈیڈ بسکٹ ہیں اور اس کی قیمت پانچ سو روپے ہے۔''

☆☆☆

غزلیات

شفیع اقبال
Editor,Parwana-e-Deccan
HillCottage.13-1-1235/309
JhirraP.O:Karwan.Hyd-50000

تہذیبِ نو میں خود کو یہاں ڈھالنا پڑا
دیوانگی سے ہوش و خرد مانگنا پڑا
ان کی شکست مجھ کو گوارا نہ ہو سکی
بازی کو جیت کر بھی مجھے ہارنا پڑا
مبہم سی گفتگو تھی نگاہوں کی اس لیے
لفظوں کی چلمنوں سے انھیں جھانکنا پڑا
وعدہ کیا تھا ہم نے ملاقات کا مگر
ان ہی کی بے رخی کے سبب ٹالنا پڑا
جذباتِ دل کو شعر کے سانچے میں ڈھال کر
دنیا کو یوں متاعِ سخن بانٹنا پڑا
سورج نئے نئے جو ابھرنے لگے شفیعؔ
تاریکیوں کو زادِ سفر باندھنا پڑا

محمد نوشاد نورنگ
102,Raushankiran.1-RaviNagar.
KhajranaRoad.INDORE-452018(M.P)

تمہاری محفل میں آئے تھے جو وہاں سے اٹھ کر وہ خوار آئے
خود اپنے ہاتھوں ہی بیخودی میں وہ اپنی پگڑی اتار آئے
ملا نہ ہم کو سکوں کا لمحہ نہ چین پایا کبھی بھی ہم نے
غموں کے طوفان زندگی میں ہماری یوں بے شمار آئے
سفر کی ساری صعوبتوں کو نہ لایا خاطر میں ہم نے ہرگز
تھکن کو اپنی جھٹک کے چہرے سے راستے میں اتار آئے
خوشی کے بدلے غموں کی دولت ملی ہے ہم کو ہر اک جگہ پر
چلے تھے پھولوں کی آرزو میں ہمارے حصے میں خار آئے
خزاں کا موسم ہے ٹھہرا ٹھہرا ہماری ہستی کے گلستاں میں
کبھی تو پھولوں میں تازگی ہو کبھی تو فصلِ بہار آئے
ہے جن کی رحمت کا فیض حاصل زمانے بھر کو ہمیشہ نورنگؔ
انھیں کی چوکھٹ پہ ہو کے حاضر نصیب اپنا سنوار آئے

گوہر شیخ پوروی
P.BoxNo.2092.BanarasCantt-221002

دشتِ ہستی میں وہ راہِ نامساعد چھوڑ دے
یہ کبھی ممکن نہیں میداں مجاہد چھوڑ دے
ادھ جلی بیڑی کے ٹکڑے میز پر گرد و غبار
میری تنہائی کے یہ سارے شواہد چھوڑ دے
مغربی تعلیم ہی اولاد کو جب دی گئی
کیا غلط ہے وہ اگر دیر و مساجد چھوڑ دے
پھر وہی کرفیو وہی وحشت نظر آنے لگے
سانپ نفرت کا اگر بستی میں حاسد چھوڑ دے
منحرف اولاد ہوتی ہے تو ہو جائے مگر
خود ہی لختِ دل کو کیسے کوئی والد چھوڑ دے
تیری غزلوں پر بھی گوہرؔ ہوں گی تنقیدیں بہت
کیوں یہ کارِ خیر آخر آج ناقد چھوڑ دے

حافظ کرناٹکی
جنرل سکریٹری انجمن اطفال،
پوسٹ باکس نمبر ۶، شکاری پور۔ شیموگہ۔ 27 کرناٹک

سج گئے آنسو آنکھوں میں
جل پڑے جگنو آنکھوں میں
دل پہ قبضہ کرنے کی
ہے قوت ، قابو آنکھوں میں
رقص میں دیکھا پھولوں کو
بج گئے گھنگھرو آنکھوں میں
نہر بہا مت اشکوں کی
رہنے دے خوشبو آنکھوں میں
جھوٹی تعبیریں بولے
جھانک کے سادھو آنکھوں میں
تول سکے جو انساں کو
ہے وہ ترازو آنکھوں میں
سب کو جو زیر کرے حافظؔ
ایسا ہے جادو آنکھوں میں

مرغوب اثر فاطمی
Ali Ganj.Road No.7,Gaya
موبائل9431448749

حیرت سے مشک پوچھ رہا ہے لوبان سے
کس شوخ کا تھا تذکرہ کسکی زبان سے
اپنا سمجھ کے جسکو سنایا تھا حالِ دل
بیٹھا ہوا ہے بزمِ رقیباں میں شان سے
یہ انگلیاں جلی ہیں جلانے میں کاغذات
ہم دیکھنے لگے تھے لفافے کو دھیان سے
بھیگے ہوئے بدن کی جواں شعلگی کا راز
گھبرا کے ابر پوچھ اٹھے آسمان سے
کیا کیا جہاں میں گذرا ہے اس اک نظر کے بعد
ہم منسلک ہیں اب بھی اسی ایک آن سے
دو انتہا کا حال جو دیکھا تو یوں لگا
اچھا ہوا میں کھسکا نہیں درمیان سے
کوئی نگاہ داری نہیں نقص سے بعید
رکھئے اثرؔ امید تو کس پاسبان سے

ارشد قمرؔ
DaltonGanj.Plamu.Jharkhand

فکر و خیال کو مرے ایسا کمال دے
قائم رہے ہمیشہ وہ رنگِ جمال دے
ہوگی نہ جانے کب یہاں اس رات کی سحر
ایسے میں کوئی آ کے اذانِ بلال دے
ہر سمت نفرتوں کا سمندر ہے موجزن
الفت کی ناؤ لے کے کوئی اس میں ڈال دے
میں نونہالِ وقت ترستا ہوں پیار کو
باہوں میں اپنی لے کے مجھے بھی اچھال دے
آباد تھے کبھی یہاں تہذیب کے نگر
اس شہرِ بے نوا کی کوئی کیا مثال دے
بخشی ہے جس نے اب بھی قمرؔ کو عروجِ حسن
اس کے عروج کو نہ خدا تو زوال دے

مسلم نواز

Baitul Kasim.12/3/H/1
PatwarBaganlLane
Kolkata-9,Mob-9681811271

میں بادہ نوش نہیں ہوں خمار کیسا ہے
مرے بدن میں نشے کا یہ وار کیسا ہے
ابھی تو دن کے اجالوں سے کھیلنا ہے مجھے
یہ میرے شانوں پہ زلفوں کا ہار کیسا ہے
نہیں ہے کوئی مرا اور میں کسی کا نہیں
تو دھڑکنوں میں مری انتشار کیسا ہے
کبھی بہار کی صورت کبھی خزاں کی طرح
ترے جہان کا یہ کاروبار کیسا ہے
مری صدائیں پلٹ کر صدائیں دیتی ہیں
کوئی بتائے مجھے یہ دیار کیسا ہے
نوازؔ مجھ کو بتادے سبب اداسی کا
ترے گلے میں یہ اشکوں کا ہار کیسا ہے

ڈاکٹر حبیب راحت حباب
146,Imlipura.GaliNo-1
Khndwa-450001(M.P)

چاند ہے کاسہ بکف بدرالدجیٰ کے سامنے
رونقیں ہیں سرنگوں شمس الضحیٰ کے سامنے
ہاتھ جب پھیلا دیے ہم نے خدا کے سامنے
اسلحے سب کند ہیں دستِ دعا کے سامنے
دیدنی عالم تھا دل کا جب پسِ پردہ تھا وہ
اوراب حیرت میں ڈالا اس نے آ کر سامنے
بس ترا ہی نام لے کر آج اے ربِ کریم
رکھ دیا ہے اک دیا ہم نے ہوا کے سامنے
ایک دن پچھتائے گا تو اے جفا جو جان لے
یہ جفا کیا چیز ہے میری وفا کے سامنے
اے حبابؔ اس دامنِ عصیاں کو پہلے دھو تو لو
جاؤ گے کس منہ سے ورنہ تم خدا کے سامنے

ڈاکٹر قمر الزماں
SBI MTPC. DVC Colony
Bankura-722183

جو پوچھے بھی تو کیا کوئی دلِ رنجور سے پوچھے
اگر پوچھے تو سچ پوچھو کسی مسرور سے پوچھے
یہاں اب پوچھنے کا بھی ادب باقی نہیں یکسر
کوئی جو خیریت پوچھے تو تھوڑی دور سے پوچھے
بہت انگڑائی لیتا ہے مسلسل گنگناتا ہے
ہنر دن کاٹنے کا شہر کے مزدور سے پوچھے
جو ہم ہیں پوچھنے والے تو تم ہو پوچھنے والے
کہ کیا ہوتا ہے فرق ان میں کوئی غیّور سے پوچھے
جو پوچھے بھی تو کیوں پوچھے اگر پوچھے تو کیا پوچھے
ہمارا حال ظاہر ہے کسی لنگور سے پوچھے
کوئی پوچھے نہ پوچھے اے زماںؔ ہم تو بتائیں گے
وہ شولا پور سے پوچھے کہ سنگا پور سے پوچھے

راہی صدیقی
Retd.S.A.O CivilCourt.No-1/53,Gypson
ganj(Rly.Ganj)Hardoi-241001(U.P)

یوں کاغذی پھولوں سے تو فنکار بہت ہیں
چہروں پہ شرافت لیے مکار بہت ہیں
یہ بات الگ کس پہ بھروسہ کریں پھر بھی
دنیا میں ابھی صاحبِ کردار بہت ہیں
رشوت کے بنا کام تو ہوتا نہیں اپنا
ہونے کو تو یوں خادمِ سرکار بہت ہیں
باتوں کے دھنی کچھ ہیں تو تلوار کے دھنی
دل والے بھی، دل پھینک بھی دلدار بہت ہیں
دیکھا ہے دوعالم نے یہاں شقِ قمر بھی
ایسے بھی زمانے میں چمتکار بہت ہیں
راہیؔ میں بیاں کیسے کروں حالِ زمانہ
کہنے کے لیے پاس میں اشعار بہت ہیں

شفیق پروین (بنگلورؔ)
Mob-9448542423

میں ہوں خوشبو تو ہوائیں ہیں سفینہ میرا
کس میں ہے دم کہ کوئی روک لے رستا میرا
اجنبی بن کے گزرنے کی ادا خوب سہی
دل میں تیرا تو کبھی تھا نہ بسیرا میرا
آئینہ دیکھ کے آخر مجھے حیرت کیوں ہو
قابل رشک تھا ہر عہدِ گزشتہ میرا
کوئی تدبیر چرا سکتا ہے نہ تقدیر میری
مجھ میں محفوظ ہے ہر علم و سلیقہ میرا
میرے اظہار صداقت کی عطا ہے یہ شفیقؔ
نادرہ کار ہیں اشعار تو گل سا لہجہ میرا

نسرین بانو نکہت
QtrNo:C-34,Sector-15
Rourkela-769003(Odisha)

دیکھیے نامہرباں اب مہرباں ہونے لگے
تنکے تنکے اب ہمارا آشیاں ہونے لگے
جستجو منزل کی دل میں تھی تو ہم چلتے رہے
ہوگیا مشکل سفر بے کارواں ہونے لگے
اپنے بچپن کی ہمیں خوش فہمیاں یاد آ گئیں
دل کے گلشن میں بہاروں کے نشاں ہونے لگے
فکر کی لو جب ہمارے دل میں روشن ہوگئی
پھر خیالوں کے اجالے کہکشاں ہونے لگے
ہیں فقط ویرانیاں نکہتؔ کے چاروں سمت اب
رونقیں ساری اُدھر ہیں وہ جہاں ہونے لگے

محمد ہارون سیٹھ سلیم بنگلوری

2-B,2ndFloor.RagencyPlazzo
No.8,HallRoad.RichardsTown
Bangalore-560005

اے خدا میری دعاؤں میں اثر ہے کہ نہیں
تلخ راتوں کی بتا کوئی سحر ہے کہ نہیں
شرم آتی ہے مجھے گھر سے نکلنے کے لیے
شرم ساروں کے لیے راہ گزر ہے کہ نہیں
دشمنوں کی ہے مرے گھر پہ نظر مدت سے
ان کی نظروں میں کوئی اور بھی گھر ہے کہ نہیں
چہرۂ سرخ پہ کیسی یہ شکن اے ساتھی
جسمِ نازک میں ترے خونِ جگر ہے کہ نہیں
ہوگئیں کوششیں ناکام تجھے پانے کی
ہے تڑپ جتنی اِدھر اتنی اُدھر ہے کہ نہیں
لوگ دیوانہ مجھے کہتے ہیں چوراہے پر
"جس کا دیوانہ ہوں میں اس کو خبر ہے کہ نہیں"
تیرگی کیوں ہے سلیمؔ آج گھروندے میں ترے
آج بتّی وہ ترے دیپ کی تر ہے کہ نہیں

حیرت فرخ آبادی

KhoslaHouse.NorthOfficePara
Doranda.Ranchi-834002

یہ کہانی، یہ فسانہ بس اسی شب بھر کا ہے
زندگی شیشے کی ہے اور آدمی پتھر کا ہے
دوستو! اس دور کی سب سے بڑی خوبی ہے یہ
آدمی پتھر کا، دل پتھر کا، گھر پتھر کا ہے
ہے وہ کتنا خوبصورت، ہر ادا بھی دلنشیں
اس کی باتیں میٹھی میٹھی، پر اثر پتھر کا ہے
ایک مدت ہوگئی آئی نہ منزل آج تک
یہ کرشمہ بھی مرے یارو مرے رہبر کا ہے
کب تلک رکھو گے امیدِ کرم اس بت سے تم
ہے تو وہ مٹی کا لیکن اس کا دل پتھر کا ہے
ناامیدی، بے یقینی، بے بسی، بے چارگی
ایک تیرا ہی نہیں یہ قصہ اب گھر گھر کا ہے
اب گزارا غیر ممکن شہر میں حیرتؔ جہاں
ذہن ودل پتھر کے، تن پتھر کا، گھر پتھر کا ہے

سید آصف دسنوی

C-12,Sector-6.C.D.AColony
Bidanasi-14(Cuttack)

خواب آنکھوں میں سجاؤں تو مٹا دیتی ہے
زیست کس جرم کی آخر یہ سزا دیتی ہے
یاد آتی ہے لیے ہاتھ میں یادوں کے چراغ
شام ہوتی ہے تو پلکوں پہ سجا دیتی ہے
تشنہ آنکھوں میں سمندر کے نظارے بھر کر
زیست جینے کا بھی انداز سکھا دیتی ہے
جب بھی اشکوں سے لکھوں دل کی حکایت آصفؔ
اپنی پلکوں سے وہ تحریر مٹا دیتی ہے

محبوب اکبر

1/7A/2,J.K.GhoshRoad.Belgachia
Kolkata-700037 Mob-8981308944

چنگاریاں غیبت کی اڑانے کا چلن ہے
رشتوں میں یہاں آگ لگانے کا چلن ہے
چٹّان کی فطرت میں کہاں راہ بنانا
جھرنوں میں نئی راہ بنانے کا چلن ہے
ہے فکر میں پرواز نہ شعروں میں روانی
الفاظ کو بحروں میں سجانے کا چلن ہے
فطرت میں سمندر کی ہے خاموش ہی رہنا
دریا میں مگر شور مچانے کا چلن ہے
دشمن سے بھی یہ سخت کلامی نہیں کرتے
محبوبؔ یہ درویش گھرانے کا چلن ہے

طاہر حسین طاہرؔ

Khadakpura.Nanded-451601
(Maharashtra)Mob-8087570387

چراغ کوئی تو روشن کرے محبت کا
اندھیرا چارسو پھیلا ہوا ہے نفرت کا
تمام عمر ترستے رہے محبت کو
صلہ ملا یہ عزیزوں سے مہر و الفت کا
گلوں میں رہ کے بھی اکثر اداس رہتا ہوں
"عجیب حال ہے کچھ ان دنوں طبیعت کا"
سکون چھین کے ہمدردیاں جتائے گی
یہی تو کام ہے اس دور کی سیاست کا
وہ میری قوم کے کیسے امام بن بیٹھے
شعور جن کو ذرا بھی نہیں امامت کا
مرے ہی قتل کی طاہرؔ ہوئی مجھے پھانسی
عجیب فیصلہ تھا وقت کی عدالت کا

تبسم فرحانہ

RoaDNo-7,NewKarimGanj
Gaya-823001(Bihar)
Mob:9430056678

تقاضا کچھ نہ مجھ سے کیجئے سننے سنانے کا
ہر اک جملہ بہت دل دوز ہے میرے فسانے کا
ہزاروں الجھنوں سے لمحہ لمحہ ہم گزرتے ہیں
صلہ کیسا ملا ہے دوستو دنیا میں آنے کا
روایاتِ کہن کا ہر محافظ سخت حیراں ہے
سمجھ ہی میں نہیں آتا مزاج اپنے زمانے کا
بہت مشکل ہے پروازِ تخیل کا سوا ہونا
ارادہ کون کرتا ہے افق کے پار جانے کا
یہی ہے مرضیٔ مولا اسی کا ہی اشارہ ہے
وگرنہ ہم میں یہ جوہر کہاں کچھ کر دکھانے کا
ہوائے زرد لے جاتی ہے چن چن کر عقیدت سے
"تبرک ہوگیا ہے تنکا تنکا آشیانے کا"
سمندر کی طرح یوں چیخنے سے فائدہ کیا ہے
سلیقہ کرب میں بھی ہو تبسمؔ گڑگڑانے کا

علیم الدین علیمؔ
P-69,ModialiRoad(2ndFloor
Kolkata-700024(W.B)

ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی کی نذر

اخلاق کا ہیں پیکر قمرالہدیٰ فریدی
ملتے ہیں سب سے کھل کر قمرالہدیٰ فریدی

دیکھا ہے ہم نے ان کی طفلی کے دور کو بھی
تھے دوستوں میں برتر قمرالہدیٰ فریدی

کیا دور تھا نہ پوچھو ہر سو چہل پہل تھی
کیا خوشنما تھا منظر قمرالہدیٰ فریدی

دیتے ہیں درسِ الفت انساں کو وہ ہمیشہ
بے مثل ہیں سخنور قمرالہدیٰ فریدی

تقریر میں فصاحت، تحریر میں حلاوت
ہیں علم و فن کا گوہر قمرالہدیٰ فریدی

اوراق کی جبیں پر علمی بصیرتوں کے
چمکا چکے ہیں جوہر قمرالہدیٰ فریدی

ہو درس گاہِ اکبر یا ہو جہانِ اردو
ہیں ہر جگہ ہی اشہر قمرالہدیٰ فریدی

مرشد کے خانوادے میں ہو عزیز سب کے
فضلِ خدا ہے تم پر قمرالہدیٰ فریدی

جانا کہیں بھی لیکن ڈرنا نہ حادثوں سے
تم ہو غلامِ صفدر قمرالہدیٰ فریدی

مجھ کو علیمؔ اپنی آنکھوں پہ ہے بھروسہ
الماسؔ کا ہیں مظہر قمرالہدیٰ فریدی

یوسف آزاد
Zila Parishad School Urdu
Kzipura,Po,Graudol,Jalgaon
Pin-425109(M-S)

تو جس سے دل لگانا چاہتا ہے
وہی تجھ کو مٹانا چاہتا ہے

اُگلتا ہے جو شعلے نفرتوں کے
اُسی کو یہ زمانہ چاہتا ہے

سمجھتا ہے جسے تو دوست اپنا
وہ تجھ کو آزمانا چاہتا ہے

ہزاروں سر ہیں دیوانوں کے حاضر
تو جو مقتل سجانا چاہتا ہے

سکوں آرام گھر کا چھوڑ کر کیوں
تو میرے ساتھ آنا چاہتا ہے

میں اُبھروں گا اسی شدّت سے یوسفؔ
تو جتنا بھی دبانا چاہتا ہے

غلام سرور ہاشمی
GopalGanj(Bihar)
Mob:9771119044

چین دل کا نیند آنکھوں کی اُڑا لے جائے گا
یہ جنوں تو زندگی کا سب مزہ لے جائے گا

جاں ہتھیلی پر لئے پھرتے ہو جس کے واسطے
وہ سہارا دے کے تیرا حوصلہ لے جائے گا

مال و زر کی یہ ہوس رکھتا ہے اپنے دل میں کیوں
بعد مرنے کے بتا تو ساتھ کیا لے جائے گا

دیکھنے کی دل میں خواہش ہے مجھے اس تاج کی
کون میرا دوست ہے جو آگرا لے جائے گا

مطلبی دنیا میں رشتے بھی ہیں سارے مطلبی
دل لگا کر بول سرورؔ کیا بھلا لے جائے گا

شہزادا شرفی (پٹنہ)

زباں کب تک رہے خاموش ڈر سے
گزر جائے کہیں پانی نہ سر سے

متاعِ سیم و زر پردے میں رکھیے
نہ جانے کون دیکھے کس نظر سے

گلابوں پر سنبھل کر ہاتھ رکھیں
اداسی چھاگئی ہے دو پہر سے

نہ آئے گا کبھی الزام اس پر
قضا آتی ہے آئے خیر و شر سے

نہیں کچھ بادلوں سے ہونے والا
زمیں پر جتنا جی چاہے وہ برسے

بتائے کوئی یہ شہزادؔ مجھ کو
یہ دل ڈرتا ہے کیوں ختم سفر سے

شاہ نوازؔ انصاری
Mohlla,Mhtwana,Mchlisaher
Jonpur-(U-P)

دُنیا میں کیا اچھا بُرا ہے میں بھی سوچوں تو بھی سوچ
کیوں آپس میں شکوہ گلہ ہے میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

فرقوں اور مسلک میں بٹ کر مرتے رہیں گے کب تک ہم
ایک ہی جب کہ سب کا خدا ہے میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

دنیا میں جس کی عظمت کا بجتا تھا ڈنکا کل تک
قوم وہی اب کیوں رسوا ہے میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

نفرت کی یہ آگ بجھادے اپنے ذہن و دل سے تو
فائدہ کیا نفرت سے ملا ہے میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

دنیا والوں کے آگے ہم ہاتھ بھلا پھیلائیں کیوں
دینے والا ایک خدا ہے میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

شاہ نوازؔ اب دنیا میں جینا کوئی آسان نہیں
کیا جانے کب کس کی قضا ہے میں بھی سوچوں تو بھی سوچ

کتابوں کے شہر میں

(تبصرے کے لئے دو کاپیوں کا آنا ضروری ہے)

اگر اپنی کتابوں کا اشتہار بھی دیں تو تبصرہ ترجیحی بنیاد پر جلد شائع کیا جائے گا۔ ایک صفحے کے اشتہار کی شرح ایک ہزار روپے ہے۔ تبصرے کے لئے کافی کتابیں جمع ہو چکی ہیں۔ ان پر تبصرہ ترتیب وار شائع ہوتا رہے گا۔ (ادارہ)

نامِ کتاب — پرفضا (شعری مجموعہ)
شاعر۔ خداداد مونس — مبصر۔ سعید رحمانی

خداداد خاں مونسؔ صاحب ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں۔ ان کا تعلق گلابی شہر جے پور سے ہے جہاں کی ادبی فضا میں یوں تو ادب کے متعدد ستارے اپنی روشنی بکھیر رہے ہیں مگر ان سب میں مونس صاحب کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ والد ماجد کے زیر سایہ ان کی شاعری پروان چڑھی اور ارتقائی منزلیں طے کرتی رہی۔ روایت کی پاسداری کے ساتھ ان کی غزلیہ شاعری عصری میلانات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جس میں انفس و آفاق کے سبھی پہلو روشن نظر آتے ہیں۔

ان کی شاعری پر مزید کچھ کہنے سے پہلے یہ بتا دوں کہ آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر گراں قدر خدمت انجام دیں۔ سکریٹری راجستھان اردو اکاڈمی، ڈائریکٹر مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، رجسٹرار ایم ڈی ایس یونیورسٹی اجمیر کی حیثیت سے آپ کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے آپ کی خاندانی وابستگی رہی ہے اور ناظم درگاہ خواجہ صاحب کی حیثیت سے فرائض بھی انجام دے چکے ہیں۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں "طوطیِ خواجہ" کے خطاب کے علاوہ بسمل سعیدی ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔

آپ کی شخصیت ادب کے مختلف خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ شعر و شاعری کے علاوہ نقد و تحقیق اور ترجمہ نگاری کے باب میں مختلف کتابیں منظر عام پر آ کر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔ اردو کے ساتھ فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ چنانچہ ان زبانوں کی کتابوں کو بھی ایک دوسرے میں منتقل کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ۱۹۹۲ء سے جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں سے کچھ نام ہیں: بخشش کی راہوں میں (سلام و مناقب)، بکھرے ہوئے اوراق (مضامین)، کلامِ جوہر (مرتبہ)، طاقِ نسیاں (بھولی بسری اصناف سخن پر منظومات)، دیوانِ اخگر (تحقیقی) بکھرے ہوئے اوراق وغیرہ

زیر نظر مجموعہ "پرفضا" مختلف غزلوں پر مشتمل ہے۔ ایسی غزلوں کا انتخاب ہے جو ہر دور کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے تعلق سے وہ خود کہتے ہیں "ان غزلوں میں روایت کی پاسداری اور میرے اپنے تجربات و مشاہدات بھی ہیں اور ارد گرد جو کچھ ہوتا ہے اس کے اثرات بھی"۔ خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے لفظوں کی شعبدہ بازی کی بجائے حرمتِ زبان کا خاص خیال رکھا ہے اور اپنی شاعری کو اصلاحی و تعمیری جہت دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ درج ذیل اشعار ان کے رجحانِ طبع کی نمائندگی کرتے ہیں۔

پیلی دھوپ میں سرخ زمیں پر نیلے جسم۔ میرے گلابی شہر کے خونی منظر ہیں

الجھنوں کا جنگل ہے، بے وقت کے بگولے ہیں

جنگ ہے اصولوں کی ہوش کی دوا کیجئے

کس درجہ چہرے چہرے پہ خوف و ہراس ہے

جو ہے تمھارے شہر میں وہ بدحواس ہے

وہ ظلم بھی کرے ہے وہی عدل بھی کرے

مظلومیت کے پاس فقط التماس ہے

کھڑی فصلیں محبت کی جلا کر۔ نہ جانے کون نفرت بو گیا ہے

یہ اشعار عصری منظر نامہ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس کے علاوہ اشاروں، کنایوں اور استعارات و علائم اور تلمیحات کا استعمال بھی جا بجا بڑی خوبصورتی سے کیا ہے جس کی بنا پر ان اشعار میں معنوی گہرائی اور تہہ داری پائی جاتی ہے مثلاً

چمگادڑوں کے شہر کا منظر بھی ہے عجیب

اندھے کنوئیں میں خوش ہیں کہ اونچی اُڑان ہے

مظلوم کی عظمت کے ظالم بھی تو قائل ہیں

ہے کوئی مثال ایسی نیزے پہ بھی سر بولے

زمینِ کفر سے توحید کا چلن نکلا۔ کہ بت تراش کے گھر میں ہی بت شکن نکلا

اس نوعیت کے اشعار مجموعے میں جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں جن میں تشبیہہ و استعارہ کی تازہ کاریاں بھی ہیں اور جدت طرازی بھی۔ اس کے علاوہ ان غزلوں میں اسلوب کی شگفتگی، لفظوں کے حسن کارانہ دروبست اور ایک منفرد استعاراتی فضا ہموار ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر "پرفضا" کی غزلیں روایت کی پاسداری کے ساتھ عصری فضا اور آج کے مسائل کا خوبصورت اظہاریہ ہیں۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے خارجی اثرات کو داخلی کیفیات کا رنگ عطا کر کے اپنی شاعری کو انفرادی حیثیت دی ہے۔ انھیں کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

عجب مجموعۂ اضداد تھا مونسؔ کا کیا کہنا۔ ہمیشہ پھول برساتا رہا شعلہ نواؤں میں

اس مجموعے کی قیمت ۲۰۰ روپے اور شاعر کا پتہ: خداداد مونس۔ معرفت خورشید احمد خطیب۔ دفتر درگاہ کمیٹی۔ درگاہ خواجہ صاحب۔ اجمیر۔ 305001 (راجستھان)

نامِ کتاب۔ ناگپور میں اردو شاعری (تحقیقی مضامین)
مصنف۔ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل مبصر۔ سعید رحمانی

اردو زبان و ادب کے حوالے سے ناگپور ایک زرخیز خطہ ہے۔ اٹھارویں صدی سے یہاں اردو فارسی زبان کی آبیاری ہوتی آ رہی ہے۔ یہاں کے قلم کاروں نے شعر و ادب کے علاوہ تنقید، تحقیق، ڈراما، افسانہ، ناول، انشائیہ اور اطفال ادب میں اپنی تحریروں سے گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ انھیں قلم کاروں میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل ایک ہمہ جہت قلم کار کی حیثیت ست مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ تقریباً چھ دہائیوں پر محیط اپنے ادبی سفر کے دوران آپ نے اپنی بصیرت اور بصارت کے جو چراغ روشن کئے ہیں اردو دنیا ہمیشہ ان سے منور ہوتی رہے گی۔ ۱۹۸۳ء سے ان کی تصنیفات کی اشاعت کا آغاز ہوتا ہے۔ تب سے اب تک شاعری میں ۹/ تحقیق و تنقید کے باب میں ۱۶/ تاریخ و تدوین کے باب میں ۳/ شرح و تفہیم کے باب میں ۶/ اور متفرق موضوعات پر ۴/ مجموعے شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس طرح تقریباً ۳۲/ مجموعوں کے ذریعہ انھوں نے اردو ادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی پہلی تحقیقی کتاب ''ناگپور میں اردو'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی تھی جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی گئی۔ بعد میں اضافہ کے ساتھ یہی کتاب ۲۰۱۲ء میں ''ناگپور۔ سیاسی تاریخ کے تناظر میں'' کے نام سے شائع ہوئی۔

زیر نظر مجموعہ ناگپور میں اردو شاعری کا ایسا وسیع منظر نامہ پیش کرتی ہے جس سے وہاں مختلف اصناف میں ہوئی پیش رفت کا پتہ چلتا ہے۔ تقدیسی شاعری کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، مرثیہ نگاری، غزلیہ شاعری، نظم نگاری، طنز و مزاح، بچوں کی شاعری، رباعیات، قطعات جیسی اصناف پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ ان اصناف کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہے ناگپور کے قلم کاروں کی پیش کی گئی تخلیقات نہ صرف معیاری اور وقیع ہیں بلکہ ناگپور کو اردو کا ایک معتبر دبستان کی حیثیت دینے میں بھی معاون ہیں۔ ناگپور میں شاعری کی پیش رفت کے حوالے سے یہ کتاب بلاشبہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی دستاویزی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو تحقیقی اسکالروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ اس گراں قدر کتاب کی قیمت صرف ۱۴۲/ روپے اور ملنے کا پتہ۔ ساحل کمپیوٹرس۔ حیدری روڈ۔ مومن پورہ ناگپور۔ 440018 (مہاراشٹر)

نامِ کتاب۔ امعانِ نظر (تنقیدی مضامین)
مصنف۔ بدر محمدی مبصر۔ عبدالمتین جامی

بدر محمدی ایک باکمال شاعر ہونے کے علاوہ اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ اردو ادبی دنیا کی ساری آبادی کو یہ بھی معلوم ہے کہ بدر محمدی کی نثر نگاری تبصرہ نویسی کو محیط ہے۔ لیکن وہ ایک اچھے مضمون نگار و نقاد کی حیثیت سے بھی معروف ہیں۔ زیر نظر کتاب ''امعانِ نظر'' مختلف مشہور و معروف اُردو رسائل کے خاص نمبروں میں لکھے گئے تبصروں کا مجموعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ خاص نمبروں پر تبصرہ لکھنے کے لئے جس نے فہم و زکاوت کی ضرورت ہے، تبصرہ نگار کے اندر اُس کا شعور کا ہونا لازمی ہے۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ مبصر کو کسی بھی بڑے یا چھوٹے ادیب پر قلم اُٹھانے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا ہے کہ اس سے ادبی دنیا پر کیسے کیسے بھونچال آئیں گے۔ اس آنے والے بھونچال کا مقابلہ کرنے کے لئے جس ہمت و جرأت نیز ادبی فہم و ادراک کی ضرورت ہے، مبصر اس سے نا آشنا نہیں ہے۔ بطورِ خاص بڑے بڑے مشہور رسائل کے خاص نمبر میں تو درجنوں نامور ادباء نیز نقادوں کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ ان تمام ضامین کا بغور مطالعہ کر کے ایک نتیجے پر پہنچنا بھی مشکل امر ہے۔ تبصرے کا مطلب محض یہ نہیں کہ کسی ایک فن پارے یا اس کے تخلیق کار کے لئے چند تعریفی جملے جمع کر دیے جائیں بلکہ فن پارے کے اندر چھپے ہوئے معائب یا محاسن کو بھی ڈھونڈ کر نکالنا پڑتا ہے۔ جب تک ایک مبصر حق گو نہ ہو اور اس کے اندر بے باکی مفقود ہو تو وہ کامیاب مبصر نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی مبصر کے ساتھ خوشامدی کا لقب لگ جانا اس کے لئے زوال کا باعث ہو جاتا ہے۔

بہر کیف زیر نظر کتاب میں انوار الحسن وسطوی، ڈاکٹر منظر اعجاز، سہیل انجم اور راشد طراز جیسے جانے پہچانے مضمون نگاروں کے مضامین بھی بدر محمدی صاحب کے تبصروں کو سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ بدر محمدی صاحب نے موجودہ مجموعہ میں ماہنامہ انعکاس کا فراق نمبر، زبان و ادب کا حفیظ بنارسی نمبر، ماہنامہ انشاء کا گفتن نمبر، ماہنامہ بیباک کا افسانہ نمبر، زبان و ادب کا احمد یوسف نمبر، نیا دور کا شکیل بدایونی نمبر، ماہنامہ انشاء کا شکیل الرحمٰن نمبر، سہ ماہی رنگ کا گوپی چند نارنگ نمبر، انشاء کا سلور جوبلی ٹیگور نمبر، مژگان کا نئی نسل نیا ادب نمبر کے علاوہ مزید ۱۵/ تبصرے اس کتاب کی زینت بنے ہیں۔ کتاب نما کا پروفیسر مسعود حسن خاص نمبر، آج سہیل عظیم آبادی نمبر وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام تبصرہ نگاروں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ بدر محمدی صاحب نے واقعی اپنی شہرت کی لاج رکھ لی انھوں نے بھرپور تبصرے لکھے ہیں۔ تبصرے کے مختص اس مختصر جگہ میں اس پر تفصیل سے جانا ناممکن ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ چند اچھی نثری تخلیقات کو کتابی شکل دے کر انہیں ضائع ہونے سے بچانے کی ان کی کوشش لائق تحسین ہے۔

قارئین کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اس کتاب میں شامل تمام مضامین نما تبصرے عظیم آباد کے موقر روزناموں مثلاً قومی تنظیم، پندار، راشٹریہ سہارا، سنگم اور فاروقی تنظیم میں شائع ہوتے رہے تھے۔ بدر محمدی صاحب نے اس کتاب کے حرف آغاز میں خود رقم کرتے ہیں کہ ''میں اپنے تبصراتی مضامین کو اس لئے کتابی شکل دے رہا ہوں کہ یہ متعدد وقتوں میں لکھے جانے کے باوجود آج بھی تازہ ہیں، باسی نہیں ہوئے ہیں۔ ان تبصراتی و تجزیاتی مقالات کی معنویت و اہمیت آج بھی برقرار ہیں''۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی ایسی چیز جس کا ادب سے تھوڑا بھی تعلق ہے کبھی باسی نہیں ہوتی، اگر اس میں تخلیقیت موجود ہو۔ بدر محمدی کے اندر تخلیقیت ہے اس کے ثبوت میں صرف ان کے تبصرے کا مطالعہ کو پیش کرنا کافی ہے۔ عام قارئین کے لئے

اس کتاب میں بہت مواد موجود ہیں۔اس کتاب کی قیمت ۲۵۱/روپے اور ملنے کا پتہ : بُک امپوریم سبزی باغ ۔پٹنہ۴۔ (۲)منظور عادل ۲۸۔بی میکلوڈ اسٹریٹ ' کلکتہ۔۱۷

نام کتاب: چشمۂ سلسبیل (نعتیہ مجموعہ)
شاعر: تاباں ضیائی مبصر: مفتی غلام رسول رضوی (رائے بریلی)

میں نے نعتیہ شاعری بنام ''چشمۂ سلسبیل) کا مطالعہ کیا اور اس کو خوب سے خوب تر پایا۔ یہ نعتیہ شاعری درحقیقت چشمۂ سلسبیل ہے۔جس میں آبِ روانی کی طرح سلاست' روانی' روابط' سہل انگاری' اعجاز' رموز' استعارہ' معانی' فصاحت' بلاغت اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شمع ضیا پاشی کرتی نظر آتی ہے۔آپ نے نظم میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ جام پیش کیا ہے کہ کم پڑھا ہوا بھی اس سے سیراب ہوسکتا ہے اور اپنے ایمان کو آراستہ' مستحکم' مجلیٰ اور معطر کرسکتا ہے۔

جو ایک لمحہ کو مل جائے آپ کی خوشبو۔قسم خدا کہ مہ وسال کیا صدی مہکے
ہمارے پھول بھی اتنی مہک نہیں دیتے۔کہ جتنی آپ کی خاکِ گزر مہکتی ہے
تمام عطروں کی تقدیر بن گئی تاباںؔ۔رسولِ پاک کے قدموں کی دھول کی خوشبو

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت و تعظیم رضائے الٰہی اور بخشش ونجات کا ذریعہ ہے۔ اس سے جدا ہو کر اگر صالح عمل کا انبار بھی ہو تو نا قبول ہے۔تاباں صاحب نے اس کو بھی سہل انداز اور حسین پیرائے میں بیان کیا ہے جو آپ کا خصوصی امتیاز ہے۔

رب کو راضی کرنے کا آسان عمل ۔خوب کروا کرام مدینے والے کی
میرا کام ہے اس کی غلامی میں رہنا۔بخشش کا ہے کام مدینے والے کی

قیامت کا ہولناک منظر جس میں کوئی ایک دوسرے کا مددگار اور پُرسان حال نہ ہوگا نفسی نفسی کا عالم ہوگا' حتیٰ کے ماں باپ' بھائی بہن' بیوی اور اولاد سب ایک دوسرے سے راہ فرار اختیار کریں گے(علاوہ انبیاء اور اولیاء کرام کے) کہ کہیں نیکیوں کا مطالبہ نہ کردیں۔اس تباہ کن اور ہوش ربا منظر کے وقت اللہ اللہ گناہ گاروں کے دل میں عشقِ رسول اور محبت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک رمق بھی ہے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مژدۂ جاں فزا ہوگا۔شفاعتی لاہل الکبائر:۔''میری شفاعت بڑے بڑے پاپیوں کے لئے ہے''۔آپؐ نے اس کو بہت آسان اور خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔

نام لیوا ہوں ترا لاکھ گنہگار سہی ۔لاج رکھنا سرِ محشر مرے مکی مدنی

محب اپنے محبوب کو بار بار یاد کرتا ہے اور اس کے نام کو ذکرِ جمیل کے ساتھ اپنی حیات کا وظیفہ بنا لیتا ہے۔پھر اگر محبوب !محبوبِ خدا' سید الانبیاؐ' باعثِ وجودِ کائنات' فخر موجودات اور رحمتِ عالمین ہو تو محب کا عالم کیا ہوگا؟ اور ''میرے مکی مدنی'' سے جو آس لگی ہے اس نے شعر کو ثریا کی بلندی تک پہنچا دیا ہے۔

یہ تو چند اشعار مثال کے طور پر پیش کئے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ اس نعتیہ مجموعے میں ہر شعر عشقِ رسول، عظمتِ رسول، تعظیمِ رسول' غلامیِ رسول اور یادِ رسول کا انمول خزانہ ہے!!اس مجموعے کی قیمت ہے دوسو روپے اور شاعر کا پتہ:حضرت خان شاہ ولی روڈ۔پلاٹ نمبر۔۵۲' انکور نگر۔ناگچون روڈ۔کھنڈوہ۔۴۵۰۰۰۱(ایم۔پی)

نام کتاب: ندی کا جب کنارہ ڈوبتا ہے (شعری مجموعہ)
شاعر: شان بھارتی مبصر: سعید رحمانی

شان بھارتی صاحب کا تعلق کوئلے کی راجدھانی دھنباد سے ہے جس میں سے صرف کوئلہ ہی نہیں نکلتا بلکہ ادبی دنیا کے ہیرے اور جواہرات بھی پیدا ہوتے ہیں۔شان بھارتی بھی ایک ایسے ہیرے کی طرح ہیں جس کی چمک دمک سے ادبی دنیا منور ہورہی ہے۔ان کی ہمہ جہت شخصیت کئی خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔شاعری کے علاوہ نقد وادب اور صحافت کے میدان میں بھی ان کی ظفر یابیوں کے پرچم لہرا رہے ہیں۔

شاعری کا چسکہ ایسا ہے کہ آدمی دن رات اسی میں کھویا رہتا ہے۔شان بھارتی شاعری تو کرتے ہی ہیں مگر ساتھ میں اپنی صحافتی ذمہ داری بھی نبھا رہے ہیں۔ اس لئے قرطاس وقلم سے ان کا رشتہ بہت گہرا ہے۔دن کو نواسوں اور پوتوں کو وقت دینا پڑتا ہے تو رات کو کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ان کی ادبی مشغولیت کا پتہ درج ذیل اشعار سے ملتا ہے۔

یہ صحافت' یہ قلم' یہ آپ بیتی' یہ غزل ۔کوئی اُکساتا ہے مجھ کو اس لئے لکھتا ہوں میں
دن میں پوتے اور نواسے رات کو کاغذ قلم۔نیند کو اس عمر ہی میں خواب ہونا تھا ہوئی
میں نے قرطاس وقلم جب سے سنبھالا اے شانؔ۔مجھ کو نقصان میں بھی فائدہ ہونا تھا ہوا

ظاہر سی بات ہے کہ آج اردو رسالہ نکالنا خسارے کا سودا ہے مگر اس کے چلتے زبان وادب کو جو فروغ ملتا ہے وہ طمانیت کا باعث ہے۔شان بھارتی اسی لئے گھاٹے کو بھی فائدے کی بات سمجھتے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ سے پہلے ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔اولین مشترکہ شعری مجموعہ تھا' پھر بیسویں صلیب اور آخری صلیب کے نام سے دو مجموعے بالترتیب ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئے۔اب ۳۵/سال کے وقفہ سے یہ مجموعہ ''ندی کا جب کنارہ ڈوبتا ہے'' ۱۹۱۵ء میں منظر عام پر آیا ہے جس کے مطالعہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اب انھوں نے اپنے لہجے کی بازیافت کرلی ہے اور یہ لہجہ فیشن گزیدگی سے مبرّا صاف ستھرا' سادہ اور سلیس ہے' مگر اس سلاست میں گہرائی وگیرائی بھی پائی جاتی ہے۔ان کا شعری کینوس کافی وسیع ہے جس میں متنوع موضوعات کو انھوں نے بڑی خوبصورتی سے شعری پیکر عطا کیا ہے۔داخلیت کا سفر کرتے ہوئے انھوں نے غمِ

ذات کوغمِ کائنات سے ہم آمیز کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔ان غزلوں میں جہاں عصر حاضر کی قہر سامانیاں ہیں تو وہیں انسانی رشتوں کی پامالی اور ان کی فکر اسلامی کے روشن نقوش بھی مرتب ہوئے ہیں۔مثالاً چند اشعار دیکھیں:

رکھا نہیں زمانے سے مرہم کی ہم نے آس۔اپنے لہو سے اپنے سبھی زخم دھو لیے
سچ بات منہ پہ کہہ دیا کرتا ہوں برملا۔مجھ سے زیادہ کوئی برا ہے تو بولیے
ہو اتن ڈھانکنا مشکل بھی لیکن۔کسی سے مانگ کر پہننا نہیں ہے
ہماری عظمتیں سوئی ہیں خاک کے نیچے۔ہمیں سبق اب اسی خفتگی سے لینا ہے
وہ جن کے دم سے اجالوں کا تھا بھرم اے شانؔ۔غضب ہوا کہ وہی تیرگی میں ڈوب گئے

یہ اشعار ان کی خودداری، حق گوئی، وضعداری اور فکرِ اسلامی کے شاہد ہیں۔
مختصراً اتنا کہنا چاہوں گا کے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے تجربات و مشاہدات کو اس طرح شعری زبان عطا کی ہے کہ وہ نہ صرف فکر انگیز ہے بلکہ بلا کی تاثیر بھی رکھتی ہے ۔اس مجموعے کی قیمت ۹۱ / روپے اور شاعر کا پتہ 22/12 سجوا۔دھنباد 828121 (جھارکھنڈ)

چاندنی تیرا نام رے (طفلی کہانی)
مصنف۔م۔ن۔انصاری **مبصر۔سعید رحمانی**

خوشی کی بات یہ ہے کہ آج کل اردو قلم کاروں کی ایک بڑی تعداد اطفال ادب کے سرمایہ میں اضافہ کرنے میں مصروف ہے۔اس کے باوجود جتنا سرمایہ جمع ہو چکا ہے اسے تشفی بخش نہیں کہا جا سکتا ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ادب اطفال کو اس معیار تک پہنچانے کی کوشش کریں کہ وہ مغرب کے ہم پلہ ہو سکے۔

اردو میں طفلی شاعری کا آغاز دکن میں ہوا جب کہ زیادہ تر مذہبی نظمیں لکھی گئیں۔نظیر اکبرآبادی، مولوی محمد حسین آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی نے اس میں اضافہ کیا۔لیکن ان میں سوائے اسمٰعیل میرٹھی کے باقی سبھوں نے پند و نصائح کو اپنا موضوع بنایا۔البتہ حالیہ برسوں میں جدید موضوعات بھی شامل ہونے لگے ہیں۔

اسی طرح بچوں کے نثری ادب میں بھی اردو والوں نے کوئی بڑا معرکہ سر نہیں کیا ہے۔البتہ کرشن چندر اور سراج انور کے ناول نے اطفال ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔حالیہ برسوں میں وکیل نجیب ایک ایسے قلمکار ہیں جنھوں نے بچوں کے ادب میں قابل قدر اضافہ کیا اور ان کا یہ عمل آج بھی جاری ہے۔

آج کل جہاں بچوں کے متعدد رسائل شائع ہو رہے ہیں وہیں طفلی کہانیوں کے مجموعے بھی تسلسل سے شائع ہونے لگے ۔اس ضمن میں حافظ کرناٹکی، عادل اسیر دہلوی، احمد امام بالا پوری، رفیع الدین مجاہد، ڈاکٹر حبیب ریتھ پوری وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔انھیں میں م۔ن۔انصاری بھی شامل ہیں جنھوں نے زیرِ نظر مجموعہ پیش کر کے ادبِ اطفال کے اضافے کی سعی مشکور کی ہے۔ان کا تعلق مالیگاؤں سے ہے اور درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔بچوں کو کہانی سناتے سناتے اب وہ بچوں کے ادیب بن چکے ہیں۔ادارہ "نثری ادب" مالیگاؤں میں وہ ہمیشہ اپنی کہانیاں پیش کرتے رہے ہیں۔ان کہانیوں کو بے حد پسند کیا گیا جس کی شہ پا کر وہ یہ مجموعہ منظر عام پر لے آئے۔اس میں کل ۱۲/ کہانیاں ہیں جن میں زیادہ تر جانوروں سے متعلق ہیں اور کچھ کا تعلق جادو اور طلسمات سے ہے۔اولین کہانی "اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی" میں اونٹ کی سادہ لوحی بیان کی گئی ہے۔اور ایک کہانی "چاندنی تیرا نام رے" ہے جس میں سونی نام کی ایک خوبصورت ہرن اور چاندنی نام کی بکری کی تیز طراری کی اور جرأت کے قصے ہیں۔اسی طرح دیگر کہانیوں میں بھی انھوں نے کچھ نہ کچھ پیغام دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کہانی کہنے کا انداز واقعی دلچسپ ہے۔زبان کی سلاست، شگفتگی اور روانی قاری کو باندھ لیتی ہیں اور وہ پوری کہانی پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔کہانی کی یہی خوبی در اصل کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ م۔ن۔انصاری ایک کامیاب کہانی کار ہیں۔

اس مجموعے کے علاوہ ان کے زیر ترتیب مجموعے ہیں :۔دیوؤں کے کارنامے، اپسرا کی واپسی، جادو کا ہنگامہ وغیرہ۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک روایتی حصار میں قید ہیں۔یہ موضوعات اب فرسودہ ہو چکے ہیں۔جدید دور کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کے لئے ضروری ہے کہ سائنس اور ٹکنولوجی کو بھی اپنا موضوع بنائیں تا کہ ان کی کہانیاں عصری میلانات سے ہم آہنگ ہوں۔ویسے زیر نظر مجموعے کی افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔امید ہے کہ بچے اور بڑے اس کا مطالعہ دلچسپی سے کریں گے۔قیمت ہے ۸۱/ روپے اور مصنف کا پتہ ۔ 369/8 اسلام پور۔مالیگاؤں ۔ 423203 ضلع ناسک (مہاراشٹر)

نام کتاب:۔شمیم عقیدت۔شعری مجموعہ (رباعیات، نعت، منقبت، سلام و نوحے)
شاعر:۔شمیم امروہی مرحوم **مبصر۔عبدالمتین جامی**

سید شمیم امروہی (مرحوم) کی ولادت ۱۸۳۸ء اور وفات ۳۰ نومبر ۱۹۱۳ء واقع ہوئی۔خاندانِ سادات کے چشم و چراغ شمیم امروہی کے آبا و اجداد کا شمار علماء، فضلا، شعراء، نامور شاہی منصب برداروں، جاگیرداروں اور زمینداروں میں ہوتا تھا۔اپنے زمانے کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ شمیم امروہی علومِ اشرفیہ، ادب، صرف و نحو، منطق، فلسفہ، خطوط نستعلیق و شکستہ کے ماہر اور عروض و قافیہ اور معانی و بیان میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔انہوں نے کم عمری ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔

ڈاکٹر عظیم امروہی کی تحقیق کے مطابق غزل، نظم، قطعہ، منقبت، قصیدہ، مرثیہ، سلام، نوحہ، مثنوی، گیت، ٹھمری، ہزل، دوہا، چہار بست، واسوخت، قطعاتِ تاریخ، ڈرامے وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔مرثیہ گوئی میں ان کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔روشنی طبع، ریاض الشمیم، نوحہ جات شمیم، وغیرہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کافی مقدار میں مختلف اصناف سخن پر لکھے

گئے مسودّے برٹش میوزیم کے علاوہ نیشنل میوزیم (کراچی) میں محفوظ ہیں۔

الغرض شمیم عقیدت میں نعت، ومنقبت، نیز سلام ونوحے کے ساتھ شمیم امروہی کی رباعیاں شامل ہیں جن میں ایک خاص قسم کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ڈاکٹر عظیم امروہی نے اپنے طویل مقدمہ میں موصوف کی رباعیوں پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے ان کے جن محاسن کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اس کی تعریف کیے بغیر رہنا ممکن نہیں۔حالانکہ شمیم امروہی (مرحوم) کی صرف ۶۰/رباعیات ہی دستیاب ہوسکی ہیں جنھیں ان کے مجموعہ میں شامل کیا گیا ہے۔تاہم ان کی مختلف موضوعات پر کہی گئی یہ رباعیاں اس فن پر ان کی مکمل دسترس کی نشان دہی کرتی ہیں۔یہ رباعی ملاحظہ ہو:

تربت میں چلے چھوڑ کے مسند زر کی۔دنیا کا حشم ساتھ لیا کچھ نہ شمیم
تکیے کی نہ فکر نہ کچھ بستر کی ۔کیا خاک ہوا بندگی، خاکستر کی

دنیا کی دولت لٹ جائے تب بھی، سخی اگر مفلس بھی ہوجائے تب بھی وہ حوصلے نہیں ہارتا، ایک پھول نہیں ہزاروں پھول بھی مرجھائیں تو خوشبو باقی رہتی ہے۔یہ بالکل کڑوا سچ ہے۔اس خیال کو انھوں نے یوں پیش کیا ہے۔الفاظ کی بندش کے علاوہ خیال آرائی کا منفرد انداز یقیناً قابل داد ہے۔فرماتے ہیں۔

پس جائے گہر تو آبرو رہتی ہے ۔گھٹتی نہیں بے زری سے ہمت ہرگز
مفلس ہوسخی تو وہی خو رہتی ہے ۔مرجھائے ہزار پھول بو رہتی ہے

تبصرہ کے مختصر دائرے میں موصوف کی رباعی گوئی پر مکمل روشنی ڈالنا ممکن نہیں۔موصوف کی دیگر اصناف میں ان کی ہنرمندیوں کا اعتراف بھی ضروری ہے۔مثلاً حمد،نعت،منقبت،سلام اورنوحہ جیسی اصناف سخن میں بھی وہ یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ہم کو ڈاکٹر عظیم امروہی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے ماضی کے ایک گوہر نایاب کو حال کے قارئین تک پہنچانے کی سعیِ مشکور کی ہے۔افسوس کی بات ہے کہ ایسے عظیم شاعر کی تخلیقات سے قارئین اب تک نا آشنا رہے، جن کی شاعری کا معتد بہ حصہ کراچی پاکستان اور لندن کی برٹش لائبریری میں تو محفوظ ہے لیکن حال کے ناقدین شعروادب کی نظر ان پر نہیں پڑی۔حالانکہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ موصوف کی شاعری پر بھی تحقیق وتنقید کا کام ہو۔بہرحال عظیم امروہی صاحب نے اس کارِ نیک کا آغاز کر ہی دیا ہے تو آئندہ بھی اسے جاری رہنے کی امید کرسکتے ہیں۔اس سلسلے میں سید جواد حسین، سید شمیم رضا اور تقی رضا صاحبان کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو پیش کرنے کی پہل کی۔اس کتاب کی قیمت ہے ۱۵۰/روپے اور ملنے کا پتہ: سید جواد حسین، ایل A-43، ابوالفضل انکلیو۔جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

نامِ کتاب۔حرف مشدّد (شعری مجموعہ)
شاعر۔تاباں ضیائی مبصر۔عبدالمتین جامیؔ

زیر نظر شعری مجموعہ حضرت تاباں ضیائی کی تیسری کتاب ہے۔اس سے قبل اُن کی مزید دو کتابیں بنام ارتعاش (مجموعۂ غزل) اور چشمۂ سلسبیل (مجموعۂ نعت) منظرِ عام پر آکر قارئین سے دادو تحسین حاصل کرچکی ہیں۔موجودہ مجموعہ کلام ان کی غزلوں پر مشتمل ہے۔تاباں ضیائی سیماب اکبرآبادی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے قابل ترین شاگرد عزیز ضیا فتح آبادی سے اصلاحِ سخن لیا کرتے تھے۔ان کو مشاعروں میں ہردل عزیز شاعر ہونے کا شرف تو حاصل ہے ہی مختلف ادبی نیم ادبی رسائل میں مسلسل اشاعت کی وجہ سے ہندوستان بھر کے ادبا وشعراء میں بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں۔مدھیہ پردیش کے ایک گمنام گاؤں میں ۱۹۵۰ء میں پیدا ہونے والے شاعر تاباںؔ ضیائی کو ایک ایسا ماحول ملا جہاں صرف مسلم گھرانوں ہی میں اردو بولی جاتی ہے۔وہاں اردو شعروادب کی پرورش کا خیال بھی دل میں آنا کارِ محال ہے۔اردو کے رسائل یا اخبارات بھی جہاں عنقا ہیں۔اس ماحول میں بھی شعروشاعری کا ذوق کسی کے دل میں ابھرنا واقعی معجزہ سے کم نہیں۔بہرحال انھوں نے شاعری کی اور اچھے اسلوب میں کی جس سے کہ انھیں شعروشاعری کی دنیا میں وہ مقام حاصل ہوسکا جس کے وہ متمنی تھے تاہم خدا بھلا کرے ان مدیران رسائل کی جن کی نظر صرف انہیں پر پڑتی رہتی ہے جن کا تعلق اردو کے مراکز سے ہے۔مزید برآں بعض مدیران رسائل صرف اپنے خریداروں یا بہ زبان دیگر صاحب زر کی تخلیقات کو ہی شائع کرتے ہیں۔علم وفن کی آج کل کوئی قدر نہیں ہے۔عالم یا فن کار گمنامی کی تاریکیوں میں گم ہوجاتا ہے۔مشاعروں میں ٹھمکے لگانے والی شاعرات یا شاعر کی ہی مانگ رہتی ہے۔شاعری کا معیار ترنم اور اداکاری سے ناپا جاتا ہے۔آج سے تقریباً ۲۰/سال قبل مشاعروں کا معیار بہت بہتر تھا۔لیکن اب مشاعروں میں شاعروں سے زیادہ متشاعروں کی مانگ، کلام کسی کا بھی پڑھو، کلام دیوناگری حروف میں کیوں نہ لکھا گیا ہو سُر سے پڑھو تال ٹھونک کر پڑھو ،اُچک کر یا لچک کر پڑھو، سامعین کو خوش کردو۔تم اسٹار کا درجہ رکھتے ہو۔خوشی سے چالیس پچاس ہزار ایک محفل سے لے جاؤ، یہ ہے معیار۔۔۔۔

معاف فرمایئے ذرا میرا قلم بہک گیا۔تاباں ضیائی پر بات چل رہی تھی۔وہ مشاعروں میں پڑھتے ہیں لیکن معیاری کلام سے سامعین کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔شستہ اور شگفتہ زبان میں ان کی شاعری کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ عصری میلانات سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔نموتناً چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مخالفو کرو دار ورسن کی تیاری ۔ جو اہتمام سے چلنے لگی وفا کی ہوا
ہر اک کہتا ہے گھبرا کے اب کہاں جائیں۔گھروں میں حبس تو باہر چلے بلا کی ہوا
چھن نہ جائے، کہیں لذّت یہ سفر کی یارب۔میری کشتی سے بہت دور کنارہ کردے
سفر دشوار ہے درپیش اور اس پر الم یہ بھی۔جنھیں ہمراہ ہونا تھا وہ رخصت کرنے آیے ہیں

تاباں ضیائی کا یہی لب ولہجہ انھیں دیگر شعرا سے ممیز کرتا ہے۔موصوف کی شاعری میں تہہ بہ تہہ پوشیدہ محاسن کی تلاش کرنے کے لئے ان کے مجموعہ "حرف مشدّد" کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔اس کی قیمت ہے دوسو روپے اور ملنے کا پتہ: حضرت خان شاہ ولی وارڈ، پلاٹ نمبر ۱۵۲ انکور رنگر، کھنڈوا۔۴۵۰۰۰۱ (ایم پی)

نامِ کتاب: مطالعہ و تفہیم (تنقیدی مضامین)
مصنف: عمران عظیم مبصر: سعید رحمانی

ادب کے عصری منظر نامہ میں عمران عظیم ایک ہمہ جہت قلمکار کی مستحکم شناخت رکھتے ہیں۔ شعر وادب اور نقد و تحقیق پر دسترس حاصل ہے۔ وکالت جیسے خشک پیشے سے جڑے رہنے کے باوجود شعر وادب کا رچابسا ذوق پایا ہے۔ دراصل ان کی پرورش و پرداخت ایک ایسے خانوادے میں ہوئی ہے جس کا ماحول سراسر ادبی رہا ہے۔ آپ کے والد □ محترم حضرت نیر قریشی ایک کہنہ مشق اور معتبر شاعر کی حیثیت سے مقبول ہیں۔ اس طرح شاعری کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی انھیں ورثے میں ملا ہے جس کو وہ اپنے فکروفن سے مزید جلا بخشنے میں مصروف ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ کے علاوہ ان کی مزید چار تصنیفات غزلوں، نظموں، شخصیات اور نقد و تحقیق کے موضوع پر مشتمل منظرِ عام پر آ کر اہلِ ادب سے خراج حاصل کر چکی ہیں۔ بہر حال اس مجموعے کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں انتقادیات، دیہاتی معاشرے میں فلم وادب اور آج کی افسانہ نگاری پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ۱۳ ر شعرائے کرام کی شاعری کا محاکمہ ہے جبکہ تیسرے باب میں اردو شعر وادب کے تعلق سے کچھ ادبی اداروں اور شخصیتوں کی سرگرمیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

یوں تو موضوعات الگ الگ ہیں مگر بین السطور ان کی تنقیدی بصیرت محرک نظر آتی ہے۔ ان کے تنقیدی رویّے کے تعلق سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اظہارِ خیال غیر جانبدارانہ ہوتا ہے اور بے باکی و حق گوئی ان کا شعار ہے۔ اس بات کی توثیق ان کے اس قول سے کی جاسکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''ناقد کو حقائق کی شمشیرِ برہنہ کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی صاف نظر آنے لگے۔ ناقد کا کام سچ بولنے کا ہوتا ہے اور تنقید کا عمل بصیرت افروزی کا عمل ہوتا ہے۔'' ہر جگہ وہ اپنے اس قول پر عمل پیرا نظر آتے ہیں۔ ان کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے راقم الحروف کا بھی یہی خیال ہے کہ ایک ناقد کو تنقید کا حق ادا کرنے کے لیے ان اوصاف سے متصف ہونا لازمی ہے ورنہ تنقید قصیدہ خوانی ہو کر رہ جایے گی۔

مجموعے کا اولین مضمون فلم وادب کے تعلق سے دیہاتی معاشرے کے ماضی اور حال پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آج کل دیہاتوں میں بھی قدروں کی پائمالی ہونے لگی ہے اور ان میں بسنے والوں کی زندگی پر شہری اثرات تیزی سے مرتب ہونے لگے ہیں۔ اسے آج کے ترقی یافتہ عہد کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ دوسرا اہم مضمون ''مبادیاتِ تحقیق'' ہے۔ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ آج کل یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالات کا تھوک کاروبار ہونے لگا ہے۔ اس ضمن میں بہار کے ایک نامور شاعر، ادیب، ناقد و محقق کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے تحقیقی مقالات لکھنے کی فیکٹری کھول رکھی ہے۔ کوئی بھی اسکالر ۲۵ ر ہزار روپوں کے عوض ان سے تحقیقی مقالہ حاصل کر کے ادب کا ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ اس باب کا آخری مضمون ''آج کی کہانی'' ہے جس میں اردو افسانوں کی موجودہ صورت حال پر گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں جو تیرہ شعرائے کرام ہیں ان میں مظفر حنفی، معصوم شرقی، اسد رضا، عمر قریشی، انور، فرحت احساس، یونس رہبر وغیرہ جیسے معروف و معتبر شعرا کی غزلوں اور نظموں کا جائزہ انھوں نے بڑی عرق ریزی سے لیا ہے اور ہر شاعر کے اسلوب اور شعری جہت پر روشنی دالی ہے۔ یہ تمام مضامین عمران عظیم صاحب کی تنقیدی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔

آخری باب میں ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد، انجمن ترقی ہند جیسے ادبی اداروں کی تاریخ و خدمات کا احاطہ کرتے ہویے کچھ ایسی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کیے ہیں جن کا موضوع غزل کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن مثلاً ہائیکو، سہرا وغیرہ ہے۔ مجموعی طور پر یہ مجموعہ سلاستِ زبان و بیان، شگفتہ طرزِ تحریر اور منفرد اسلوبِ بیان کی وجہ سے نہ صرف لائقِ مطالعہ ہے بلکہ دعوتِ غور وفکر بھی دیتا ہے۔ امید ہے کہ ادب کا سنجیدہ حلقہ خوشدلی سے اس کی پذیرائی کرے گا۔ اس کتاب کی قیمت ہے ۸۵ ر روپے اور ملنے کا پتہ: عمران عظیم (ایڈوکیٹ)۔ چیمبر نمبر۔ 694۔ پٹیالہ ہاؤس کورٹ۔ نئی دہلی۔ 110001

نام کتاب: شاخ گل (طفلی نظموں کا مجموعہ)
شاعر: احمد امام مبصر۔ سعید رحمانی

نئی نسل کے شعرا میں احمد امام کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ خصوصاً ان کی غزلیہ شاعری تیکھے لب ولہجہ میں انفرادیت کی حامل نظر آتی ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں سے شعری سفر جاری ہے۔ اس دوران چار مجموعے منظر عام پر آکر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ پہلے دو مجموعے اکتساب اور الہام غزلوں پر مشتمل ہیں جب کہ شاخِ گل اور لائف لائین طفلی نظموں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

غزلیہ شاعری میں جہاں انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے اسی طرح طفلی نظموں میں بھی انھوں نے اپنی ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ شاخ گل کا پہلا اڈیشن ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا تھا جس کی ہر طبقہ میں پذیرائی ہوئی تو یہ دوسرا اڈیشن اسی سال اکتوبر میں منظر عام پر لے آئے۔ کسی بھی کتاب کا دوسرا اڈیشن اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب دلچسپ ہونے کے علاوہ افادیت کی بھی حامل ہے۔ بچوں کے ذوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھوں نے رنگین کاغذ پر رنگ برنگے لفظوں میں اپنی نظمیں پیش کی ہیں۔ ۸۰ ر صفحات کو محیط کل ۷۴ ر نظمیں مختلف موضوعات پر شامل کی گئی ہیں۔ یہ موضوعات بچوں کے لئے نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ انھیں صالح قدروں کو اپنانے کی

ترغیب بھی دیتے ہیں اور ان کی معلومات میں اضافہ کا باعث بھی ہیں۔مثلاً احمد کے بعد اولین نظم "میٹھی باتیں" جہاں میٹھی باتوں کی ترغیب دیتی ہے وہیں گفتگو کے آداب بھی سکھاتی ہے۔اسی طرح نظم "علم کی روشنی" بچوں کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔اس کا ایک شعر ہے ؎

علم جس کے پاس ہے دھنوان ہے۔علم سے ہی آدمی کی شان ہے

علم کے تعلق سے انھوں نے متعدد نظمیں کہی ہیں۔ان کے علاوہ ہندوستانی موسموں، جانوروں اور سواریوں پر بھی بڑی دلچسپ نظمیں شامل ہیں۔ان روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ انھوں نے عصری تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور عصر حاضر کی نئی ایجادات کو موضوعِ سخن بنا کر بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان ایجادات میں کیلکولیٹر، موبائل فون، ہوائی جہاز، کمپیوٹر وغیرہ پر بڑی خوبصورت نظمیں ہیں۔یہ ایسے موضوعات ہیں جو اس نئے زمانے کے بچوں کے لئے نہ صرف دلچسپی کا محور بنیں گے بلکہ ان کی سوچ کو تحریک بھی دیں گے۔ چونکہ احمد امام درس و تدریس کے پیشہ سے منسلک ہیں اس لئے وہ بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہیں۔بچوں کی پسند اور ناپسند کا علم رکھتے ہیں اور ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو ان کی استعداد کے عین مطابق ہے۔سلاست اور سادگی کے ساتھ یہ نظمیں سبق آموز بھی ہیں جو یقیناً بچوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا باعث ہوں گی۔مختصراً یہ کہ "شاخِ گل" کو طفلی ادب میں اضافہ ہی کہا جا سکتا ہے اور یقین ہے کہ بچے اس کا مطالعہ شوق سے کریں گے۔قومی کونسل فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع اس کتاب کی قیمت ۴۳ روپے اور شاعر کا پتہ ہے: چوڑی محل۔بالاپور۔ضلع اکولہ۔444306 (مہاراشٹر)

نام کتاب: رنگِ ہنر (شعری مجموعہ)

شاعر: رمیش کنول

مبصر۔سعید رحمانی

رمیش کنول بچپن ہی سے شاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔فلمی گیتوں سے متاثر ہو کر انھوں نے شاعری کا آغاز کیا۔اولین غزل "پرواز" لدھیانہ کے اگست ۱۹۷۲ء کے شمارے کی زینت بنی۔پھر انھوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے آج اپنی ایک منفرد شناخت بنالی ہے۔چار دہائیوں سے بھی زائد اس شعری سفر کے دوران ان کے تین شعری مجموعے شایع ہو کر اہلِ ادب سے خراج حاصل کر چکے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ چوتھا ہے جس کی اشاعت اسی سال ۲۰۱۶ء میں ہوئی ہے۔اس میں غزلوں کے علاوہ ماہیے، غزل نما، گیت اور قطعات بھی شامل ہیں۔غزل ہی ان کی محبوب صنفِ سخن ہے اور اسی کو وسیلۂ اظہار بنا کر انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کو شعری جامہ عطا کیا ہے۔ان غزلوں میں موضوع، مواد، جذبہ و احساس کی عمدہ ترجمانی کے علاوہ تشبیہہ و استعارہ کی تازہ کاری اور جدت طرازی ان کی شعری بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ان غزلوں کے ضمن میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں ایک طرح کی میانہ روی پائی جاتی ہے جس کی بنا پر ان پر کسی بھی رجحان کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔بہ الفاظِ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کلاسک اور نو کلاسک یعنی قدیم و جدید کے درمیان ایک پُل کی مانند ہے جو تہذیبی رویوں سے گزرتے ہوئے آج کے انہدام پذیر معاشرے سے ہمکلام ہوتی ہے۔اپنے ابتدائی سفر میں انھوں نے سیدھے سادے لفظوں میں غزلیں کہیں۔پھر بتدریج اشاریت، ایمائیت اور استعارات و علائم کے برملا استعمال سے اپنی شاعری کو معنوی جمال اور گہرائی و گیرائی عطا کی۔اس نوع کی شاعری پر کچھ کہنے سے پہلے یہاں مثالاً چند اشعار پیش ہیں جن میں حسن و عشق کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے:۔

احساس کے آنگن میں کوئی پھول کھلا ہے۔آتا ہے بہت یاد کنولؔ یار کا چہرہ

مہک اس کے گیسو کی آنے لگی۔مرے گھر کی جانب چلا ہے کوئی

تمہارے جسم کے اشعار مجھ کو بھاتے ہیں۔مری وفا کی غزل تم بھی گنگنایا کرو

اور جب وہ استعاراتی طرزِ اظہار اپناتے ہیں تو بڑے خوبصورت شعر ان کی نوکِ قلم سے ڈھلنے لگتے ہیں اور بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں غیر ذی روح انسانی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً:۔

روز ڈوبے ہوئے سورج کو اگا دیتی ہے۔رات کس کس کو اندھیرے میں صدا دیتی ہے

آگ ہر خواب کے جنگل میں لگا دیتی ہے۔وقت کی دھوپ مجھے کیسی سزا دیتی ہے

پہلے شعر میں رات کا صدا دینا اور دوسرے شعر میں دھوپ کا منصفی کردار ادا کرنا سراسر انسانی افعال ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ اشعار ہمیں ایک نیے ذائقے سے روشناس کراتے ہیں۔ان کا استعاراتی نظام بھی لائقِ تحسین ہے۔تعلق کا دریچہ، ملاقات کا آنگن، فاصلوں کا چراغ، قربتوں کا دیا جیسی تراکیب کے حسن کارانہ استعمال نے ان اشعار میں تہہ داری پیدا کردی ہے۔یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بند کرنا نہ تعلق کے دریچے کو کبھی۔تم ملاقات کے آنگن کو منور رکھنا

فاصلوں کے چراغ گل کر کے۔قربتوں کے دیے جلاؤں گا

اس قسم کے انگنت اشعار کا حوالہ دیا جا سکتا ہے مگر اس مختصر سے تبصرے میں سب کا احاطہ ممکن نہیں۔اس لئے آخر میں ان اشعار کے ساتھ اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا جن سے ان کی صالح فکری، تعمیر پسندی اور انسانیت نوازی مترشح ہے:۔

یوں اختلاف بڑھ گیا قوموں کے درمیاں۔ملت کے سائبان سلامت نہیں رہے

دونوں ملکوں میں محبت ہو امن چین رہے۔اے کنولؔ ایسا دعاؤں میں اثر ہو جائے

مجموعی طور پر "رنگِ ہنر" اپنے تعمیری جہات اور افادی پہلوؤں کے سبب ایک لائقِ مطالعہ مجموعہ ہے اور امید ہے کہ ادبی حلقہ خوشدلی سے اس کی پذیرائی کرے گا۔رنگین اور دبیز کاغذ پر چھپے اس مجموعے کی قیمت ہے ۵۰۰ روپے اور شاعر کا پتہ۔رمیش کنول۔۶۔منگلم وہار کالونی۔آرہ گارڈن روڈ۔جے دیو پتھ۔پٹنہ۔800014

☆☆☆

طرحی مشاعرہ

مصرعِ طرح "درد کم ہے تڑپ زیادہ ہے" پر غزلیں پیش ہیں۔ اگلے شمارے کے لیے طرح نوٹ فرمائیں: "کوئی پوچھے تو میں کیا نام بتاؤں تیرا" (عرفان صدیقی) قوافی: بتاؤں، دکھاؤں، سناؤں وغیرہ۔ ردیف۔ "تیرا"۔ پانچ اشعار پر مشتمل آپ کی طرحی غزل ۲۸ فروری ۲۰۱۷ء تک ہمیں مل جانی چاہیے۔ رسالہ اگر تاخیر سے ملے تو وصول یابی کے ایک ہفتے کے اندر ارسال کر سکتے ہیں۔ (ادارہ)

سید اسلم صدا آمری۔ چنئی موبائل۔ 94447522605

ہر قدم ناشناس جادہ ہے — ہم سفر تیرا کیا ارادہ ہے؟
یہ بھی ان کا ہے ایک طرزِ کرم — "درد کم ہے تڑپ زیادہ ہے"
دونوں عالم کا مالک و مختار — وہ بشر پھر بھی سیدھا سادہ ہے
سنتی پیرہن میں ہر کوئی — خوبصورت ہے خوش لبادہ ہے
میں صداؔ آمری ہوں اور میرا — قادری چشتی خانوادہ ہے

ایوان علیم ڈاکٹر فاروق میں اعظم

قدیر احمد قدیر (ہلکوٹی کرناٹک) موبائل۔ 9980208578

رزق دے گا وہ سب کو وعدہ ہے — کچھ کہیں کم، کہیں زیادہ ہے
دل سے مانے گا ہر کوئی اپنا — ظرف گر آپ کا کشادہ ہے
ہاتھ ہم نے چھڑا لیا ورنہ — اس نے پوچھا تھا کیا ارادہ ہے
زخم ایسا ہمیں دیا اس نے — "درد کم ہے، تڑپ زیادہ ہے"
ذکر اس کا کروں قدیرؔ ہر پل — بس اسی کام کا اعادہ ہے

ایوب عادل (چاپدانی) موبائل۔

آپ کا دل اگر کشادہ ہے — فرش پر کیوں شریف زادہ ہے
آپ کا ساتھ وقت بھی دے گا — آپ کا نیک گر ارادہ ہے
اس نمائش پہ مت بھروسہ کر — یہ نمائش تو اک تماشا ہے
تیری بخشی ہوئی محبت میں — "درد کم ہے، تڑپ زیادہ ہے"
وہ تمہارا نہیں میاں عادلؔ — جو یہ دعویٰ کرے تمہارا ہے

محمد یٰسین ابن عمر (سیتاپور) موبائل۔ 9807023540

دورِ حاضر کا یہ تقاضا ہے — میرے گیتوں میں درد زیادہ ہے
اس کے بے وقت یوں بچھڑنے سے — "درد کم ہے تڑپ زیادہ ہے"
کل بجھاتا تھا پیاس صحرا کی — آج دیکھو وہ خود ہی پیاسا ہے
چھوڑ کر زندگی کا ہاتھ اک دن — موت تجھ سے ملوں گا وعدہ ہے
پھر وہ یٰسینؔ کا نگہباں ہے — جانے قاتل کا کیا ارادہ ہے

محمد یونس عاصم (ڈھینکانال، اڑیسہ) موبائل۔ 7789811686

کوئی منزل نہ کوئی جادہ ہے — پھر سفر کا مرا ارادہ ہے
رنج و غم خیریت سے رہتے ہیں — دل کا کمرہ بہت کشادہ ہے
زندگی کا سوال ہر لمحہ — سامنے میرے ایستادہ ہے
زخم اپنوں نے جو دیئے ان میں — "درد کم ہے، تڑپ زیادہ ہے"
زندگی کی کتاب میں عاصمؔ — بابِ انسانیت کا سادہ ہے

محمد امجد سلیم امجدؔ (کریم نگر) موبائل۔ 9550664623

آج کل رنج و غم زیادہ ہے — زندگی مشکلوں کا جادہ ہے
کفر نقصان کی روش ہے میاں — حق کی تحصیل میں افادہ ہے
دورِ حاضر میں بے حیائی کا — عریاں عریاں سا ہر لبادہ ہے
اپنی تہذیب کی بصیرت کا — آئینہ سیدھا اور سادہ ہے
شاعری کیجیے بلیغ امجدؔ — علم دل میں اگر کشادہ ہے

مفتاح اعظمی (چاپدانی) موبائل۔ 8478987508

اس کا لہجہ جو سیدھا سادہ ہے — یہ بزرگوں سے استفادہ ہے
یہ ضروری نہیں کہ دل بھی ہو — گھر کا آنگن اگر کشادہ ہے
کل جو اونچی اڑان بھرتا تھا — آج وہ شخص پا پیادہ ہے
زخم مجھ کو دیے جو اپنوں نے — "درد کم ہے تڑپ زیادہ ہے"
فاعلاتن میں ناپ لیں مفتاحؔ — پیش کی ہے غزل جو تازہ ہے

طاہر حسین طاہر (ناندیڑ، مہاراشٹر) موبائل۔ 8087570387

چوٹ کھانے کا پھر ارادہ ہے — معاملہ دل کا سیدھا سادہ ہے
فرقتوں کا عذاب مت پوچھو — "درد کم ہے، تڑپ زیادہ ہے"
زخم گہرے بہت دیے اس نے — جانے اب اور کیا ارادہ ہے
آج تم کو نہ دیکھ پائیں گے — آج خواہش بہت زیادہ ہے
عشق میرے حبیب کا طاہرؔ — میری منزل ہے، میرا جادہ ہے

محمد عبدالقدیر طاہر (کریم نگر) موبائل۔ 9700969840

آدمی کتنا خوش لبادہ ہے — کھوٹی نیت، برا ارادہ ہے
بھول جانے میں یاد کا خدشہ — یاد رکھنے میں ہی اِفادہ ہے
تیری چوکھٹ پہ جان دے دوں گا — دیکھ لینا یہ میرا وعدہ ہے
آہ! کس آدمی نے مجھ کو ڈسا — "درد کم ہے، تڑپ زیادہ ہے"
کس لیے ان کے محل میں طاہرؔ — روشنی آج کچھ زیادہ ہے

مقصود اشرف (مالیگاؤں) موبائل۔ 9373226855

چوٹ گہری ہے زخم سادہ ہے — "درد کم ہے، تڑپ زیادہ ہے"
کیا ہمیشہ جہاں میں رہنا ہے — کیوں تمنا کو سر پہ لادا ہے
جھیل لوں گا تمہارے سارے غم — خیر سے دل مرا کشادہ ہے
تو گناہوں سے اپنے توبہ کر — بخش دے گا یہ اس کا وعدہ ہے
دل بھی اتنا ہی صاف ہے مقصودؔ — جتنا اجلا ترا لبادہ ہے

ادب پیما

(ادبی' تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں)

بھاگلپوری کے نام ایک شام

بتاریخ ۳۱/اکتوبر ۲۰۱۵ء کی شام ایک محفلِ شعر و نغمہ ایوانِ علیم میں ڈاکٹر فاروق اعظم صاحب کے اعزاز میں منعقد ہوئی جس کا آغاز شاہد مدراسی کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ اس محفلِ شعر و نغمہ کی صدارت مدراس کے استاد شاعر حضرت حسن فیاض نے فرمائی۔ مہمانانِ ذی وقار ڈاکٹر فاروق اعظم کا تعارف پیش کرتے ہوئے علیم صبانویدی صاحب نے بہار شریف کی مجموعی علمی اور ادبی خدمات کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے شاد عظیم آبادی' سہیل عظیم آبادی' کلیم الدین احمد' ڈاکٹر وہاب اشرفی' کلام حیدری' ڈاکٹر نجم الہدیٰ' ڈاکٹر علیم اللہ حالی' علامہ ناوک حمزہ پوری' مظہر امام' ڈاکٹر طلحہ رضوی برق' ڈاکٹر لطیف الرحمٰن اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے علمی اور ادبی کارناموں کا منظرنامہ پیش کیا اور کہا ان اکابرین علم و ادب سے بہار کا شناخت نامہ اردو کی تاریخ میں روشن ہے۔

اس محفلِ شعر و نغمہ کی نظامت ڈاکٹر حیات افتخار صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے سنبھالی۔ محفلِ غزل میں شہزادآبرو' شاہد مدراسی' ماہر مدراسی' نواب ببر علی ببر' دولت مدراسی' سراج شاناؔ' علیم صبانویدی' اور صدر جلسہ حسن فیاض نے حصہ لیا۔ تقریباً دو گھنٹوں تک شعر و شاعری کی خوبصورت بزم سجی رہی۔

رات ٹھیک نو بجے محفلِ نغمہ کی شروعات ہوئی جس میں جناب لیاقت' جناب قاسم' جناب دلاور' جناب کے۔ عظمت' جناب روح اللہ نے اپنی دلکش اور دلآویز آواز سے محفل کو نور' علی نور' بنایا۔ اس محفلِ نغمہ کے اختتام کے بعد حضرت علیم صبانوید نے فرداً فرداً تمام ارباب علم و ادب کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنے کے بعد محفل شعر و نغمہ کے شرکاء سے مؤدبانہ گزارش کی کہ اب وہ تناول وطعام کے لئے Sealord ہوٹل تشریف لا کر ہمیں شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

ایوانِ علیم چینئی میں ادبی و تنظیمی نشست

مورخہ ۲۵/ستمبر ۲۰۱۶ء کی شام ایوان علیم چینئی میں ایک اعزازی و ادبی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر عبید الرحمٰن احساس سابق صدر شعبۂ اردو نیو کالج چینئی نے فرمائی۔ اس میں تملناڈو میں منعقدہ مشاعروں کے تعلق سے گفت و شنید ہوئی کہ تملناڈو کے ادبی اداروں اور مشاعروں میں شمالی ہند کے اہم ترین شعراء و ادباء کی شمولیت کو ترجیح دی جاتی ہے اور ان تقریبوں اور مشاعروں کو نہایت شاندار پیمانے پر ای ٹی وی کی وساطت سے ساری دنیا میں شہرت و مقبولیت حاصل

ہوتی ہے۔ مگر تملناڈو کے کسی بھی شاعر کو آج تک شمالی ہند میں منعقدہ جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کے مواقع نہیں دئے جاتے ہیں' جب کہ تملناڈو کے مقتدر شعراء و ادباء کے تاریخی کارنامے منصۂ شہود پر آچکے ہیں۔

اس متعصب روّیے کے ردِعمل میں تملنادو کی اہم ترین انجمنوں میں یہ طے کیا گیا کہ چینئی میں عنقریب اعلیٰ پیمانے پر ایک ایسے مشاعرے کا انعقاد ہو جس میں صرف تملناڈو کے نمائندہ شعراء کی شمولیت ہو اور اس مشاعرے کا منظرنامہ ای ٹی وی اردو کے ذریعے عالمِ شہود پر آئے۔

اس قرارداد کی منظوری کے بعد ایک شعری نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت حضرت علیم صبانویدی اور نظامت کے فرائض سراج زیبائی نے بہ حسن خوبی انجام دئے۔ عزیز الشعراء حضرت حسن فیاض اور پروفیسر عبید الرحمٰن احساس' شاہد مدراسی' مہمانانِ خصوصی رہے۔ یہ نشست بڑی مختصر رہی مگر بڑی جامع اور وقیع اور جاندار رہی زبان و ادب کے فروغ کے لئے اس طرح کی ادبی و شعری نشستیں ایوانِ علیم میں اکثر ہوتی رہتی ہیں جو تملناڈو اردو پبلیکیشنز اور تملناڈو اردو لٹریری ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ہوتی ہیں۔ اس کا سہرا شاہد مدراسی کے سر جاتا ہے۔

(مرسلہ) ڈاکٹر جاوید حبیب چیرمین تملناڈو اردو پبلی کیشنز چینئی

این سی پی یو ایل کے تعاون سے وائڈ ویژن نے گاندھی پیس فاؤنڈیشن نئی دہلی میں ادبِ اطفال پر سمینار کا انعقاد

آج کا بچہ کل کے بچے سے ذہنی بنیاد پر بہت بدلا ہوا ہے: حبیب سیفی

نئی دہلی 29/اگست' پریس ریلیز: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے مالی تعاون سے وائڈ ویژن ویلفیئر فاؤنڈیشن رجسٹرڈ نئی دہلی کے زیر اہتمام ادب اطفال پر سمینار منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر صادق نے فرمائی اور نظامت شعیب رضائی فاطمی نے انجام دی۔ بمقام گاندھی پیس فاؤنڈیشن' دین دیال اپادھیائے مارگ آئی ٹی او نئی دہلی میں ادب اطفال کے ذریعے اردو کی نشو و نما کے عنوان سے منعقدہ اس سمینار میں مقالہ نگاروں نے ضمنی سرخیوں کا انتخاب اپنے تخلیقی رجحان کے مطابق کیا اور عمدہ مقالے پڑھے۔ سمینار کے صدر پروفیسر صادق نے ادب اطفال کو آج کے وقت کی ضرورت قرار دیتے ہوئے اس سمینار کو بہت ہی اہم بتایا۔

ہمیں خوشی ہے کہ نئے لکھنے والوں کی ماضی پر بھی نظر ہے؛ امید افزا مستقبل کا بھی خیال اور حال کے زمانے سے واقفیت بھی' سارے ہی مقالے پُر مغز ہیں۔ حبیب سیفی نے اپنے مقالے میں کہا کہ ادبِ اطفال کے لئے بھی زبان کی لطافت وندرت' خیال کی رفعت' اور جذبے کی صداقت ضروری ہے۔ حقیقی معنوں میں انسانی جذبے کی حرارت سے معمور ادب بچوں کے اندر ہمت پیدا کرتا ہے۔ ادبِ اطفال کے بہت سے موضوعات ہیں۔ اور اس میں اضافے کی بھی گنجائش ہے۔ کیونکہ آج کا بچہ کل کے بچے سے ذہنی بنیاد پر بہت بدلا ہوا ہے۔ ذہنی سوچ میں بہت تیزی سے تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ صرف کہنے کی حد تک وہ مختلف ذہن ودل کا مالک ہے' بلکہ اس کی رغبت اور تجسس ان چیزوں کی طرف ہوتی ہے جو اس سے دور ہوتی ہیں۔ جس کام کی ممانعت بچوں کو کی جاتی ہے وہ اسے کرنے پر آمادہ رہتے ہیں کیونکہ بچوں کی یہی فطرت ہے۔۔

مانا کہ اسماعیل میرٹھی' اقبال' الطاف اور شفیع الدین نیر وغیرہ کی درس آموز نظمیں اپنے وقت کی عمدہ تخلیقات میں سے ہیں مگر آج ادب اطفال کے ذریعے اردو کے نشو ونما پر غور کرنے کے لئے ادب تخلیق کرنے والوں کو سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ سائنسی موضوعات پر ادب اطفال میں لکھنے کا چلن برسوں سے جاری ہے۔ اس میں تیزی بھی آئی ہے۔ بچوں کی ذہنی سطح کو مدنظر رکھ کر ادب کی تخلیق کوئی آسان کام نہیں۔ اس لئے جو لوگ بچوں کے ادب پر کام کررہے ہیں ان کا بھی حق ہے کہ وہ بھی سراہے جائیں۔ ادب اطفال کو مقبول بنانے کی سمت میں تخلیقات کے متعلق ٹھوس قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ دیگر مقالہ نگاروں میں پروفیسر ابن کنول' ڈاکٹر خالد علوی' ڈاکٹر ظفر مرادآبادی' شعیب رضا فاطمی' طٰہٰ نسیم' جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹر عادل حیات' ڈاکٹر خالد مبشر' ڈی یو سے سید عینین علی حق اور امیر حمزہ کا نام شامل ہے جنھوں نے مقالے پیش کئے۔ ڈائس کے مہمانوں کا مشترکہ طور پر ماننا تھا کہ ادب اطفال کم لکھا جا رہا ہے' یا ادب اطفال کی تخلیقات میں وہ کشش نہیں جس سے بچوں کو اردو زبان کی طرف رغبت دلانے میں والدین واساتذہ کو آسانی ہو۔ اس کے باوجود معاملہ غنیمت ہے۔ بچوں کا ادب پھل پھول رہا ہے۔ اس موقع پر بچوں کے ادب میں خاص دلچسپی رکھنے والوں نے شرکت کی' جن میں اردو اکادمی دہلی کے سابق پروگرام آفیسر بھائی شمیم احمد' محمد یامین' فیض اللہ' عبدالرحمٰن' راہل' انوار احمد' غفران خان' محمد سلیم' عمران' محمد شارق' محمد رضوان' اجئے چودھری' عاقب حیات' طارق حبیب' قاضی عدنان' اسعد احمد اور طارق صدیقی قابل ذکر ہیں۔ پروگرام کے کنوینر وجنرل سکریٹری مہرالسلام نے مقالہ نگاروں اور ڈائس پر جلوہ افروز مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور سمینار کے اختتام پر اظہار تشکر ادا کیا۔

افسانوی مجموعہ "جنون" کی رسم اجراء کی تقریب منعقد

مالیرکوٹلہ (پریس ریلیز) مالیرکوٹلہ کے معروف افسانہ نگار محمد فاروق کے افسانوی مجموعہ "جنون" کی رسمِ اجراء بھاشاوِبھاگ پنجاب کی ڈائریکٹر محترمہ گورشرن کے

ہاتھوں بھاشاوِبھاگ کے صدر مقام پٹیالہ میں عمل میں آئی۔ ان کے ساتھ بھاشاوِبھاگ کی ڈپٹی ڈائریکٹر شعبہ اردو میڈیم ویر پال کور' ڈاکٹر بھگوان سنگھ' ست نام سنگھ ریسرچ اسکالر کے علاوہ دیگر آفیسرز اس تقریب میں موجود تھے۔ عمر فاروق کا تعارفی خاکہ بھاشاوِبھاگ کے پروازِ ادب کے مدیر جناب اشرف محمود نندن نے پیش کیا۔ انھوں نے تقریب کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ اشرف محمود نندن نے عمر فاروق کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ موصوف مالیرکوٹلہ کے ناول نگار' شاعر' مبصر' افسانہ نگار اور محقق ہیں۔ آپ طویل عرصہ سے ادب کی خدمت کے لیے وقف ہیں۔ آپ کی ادبی نگارشات ادبی حلقوں پر بھرپور پذیرائی حاصل کرچکی ہیں۔ آپ کے افسانے سماج کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں گردوپیش کے ماحول کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ اس تقریب میں محمد اختر جوشؔ اور انجم قادری نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ بھاشاوِبھاگ پنجاب کی ڈائریکٹر گورشرن کور نے عمر فاروق کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اردو زبان کی خوبیوں پر بھی روشنی ڈالی۔ تقریب میں حاضرین شرکاء نے عمر فاروق کو افسانوی مجموعہ کی اشاعت پر

مبارکباد پیش کی۔